[illegible]

(۲۰ دل خوش کن افسانوں کا مجموعہ)

کوثر چاندپوری

مطبوعۂ مطبع انوار احمدی الہ آباد

فہرست خندۂ دِل

تہدیہ

مسٹر عبد الحمید خاں بی۔ اے (آنرز) بی۔ ایس۔ سی۔
کلکٹر جل گاؤں ضلع شرقی خاندیش کی اُن مخلصانہ
سرگرمیوں اور دلچسپیوں کے نام جو پراونشل طبی
کانفرنس جل گاؤں کے موقعہ پر موصوف نے ظاہر
فرمائیں،

کوثر چاند پوری

بھوپال ۱۷ مارچ سنہ ۱۹۴۴ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دو دن دوزخ میں

نامہ نگاروں کو مختلف لوگوں سے ملنے اور نئی معلومات حاصل کرنے کی ہر وقت فکر رہتی ہے۔ اور شب و روز انہیں یہی خیال رہتا ہے۔ میں بھی نامہ نگار ہونے کی حیثیت سے دن بھر بڑے بڑے لیڈروں سے ملاقاتیں کرتا اور اُن کے خیالات معلوم کر کے جلد سے جلد اخبار کو بھیجنے کی کوشش کرتا۔ اور ہمیشہ نئی دلچسپ اور تحیر خیز خبریں مہیا کرنے کی سعی میں مصروف رہتا۔ ایک دن صبح سویرے ہی تقریباً پانچ چھ بجے معلوم نہیں کیوں کر میں آسمان کے اُس حصہ پر پہنچا۔ جہاں دوزخ واقع ہے۔ یہ بڑا گرم اور ہیبت ناک مقام تھا مجھے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ میں جہنم سے بہت قریب ہوں۔ اور اگر جہنم کے ارباب بست و کشاد سے مل کر اندر جانے کی اجازت طلب کروں۔ تو بہت ممکن ہے کہ کامیابی ہو جائے یہ سوچ کر میں جلدی جلدی اس سمت کو چلا۔ جدھر سے ہوا کے شعلہ بار اور جسم سوز جھونکے آ رہے تھے اور حد نظر تک دھواں اُٹھتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ یقیناً دوزخ اِسی طرف ہو گا۔ میں نے دل میں کہا اور اُس رُخ کو چل دیا میرا یہ خیال غلط نہ تھا۔ تھوڑے فاصلہ پر ہی دو تین عجیب و غریب قسم

کے آدمی ملے۔ جن کے کپڑوں پر سیاہی کے دھبے تھے اور ہاتھ کہنیوں تک کالے ہو رہے تھے چہرہ کوئلہ کی باریک گرد جمی ہوئی تھی۔ یہ لوگ دنیا میں ریلوے انجنوں اور دوسری مشینوں پر کام کرنے والے آدمیوں سے مشابہ تھے میں نے پوچھا بھائی دوزخ کا راستہ کون سا ہے؟

ایک نے کہا یہی ہے مگر وہاں آپ کیوں جا رہے ہیں؟ میں دوزخ کی سیر کرنے آیا ہوں۔ کیا آپ اس سلسلہ میں میری کوئی مدد کریں گے؟

میں کچھ نہیں کر سکتا۔ آپ سیدھے چلے جائیے آگے چل کر ایک بڑا سا دفتر ملے گا۔ وہاں داروغہ جہنم موجود ہوں گے اگر وہ اندر داخل ہونے کی اجازت دے دیں گے تو آپ کی تمنا پوری ہو سکتی ہے۔

تھوڑا فاصلہ طے کرنے پر میں اس دفتر تک پہنچ گیا۔ اور داروغہ صاحب کے پاس میں نے اپنا ملاقاتی کارڈ بھیجدیا اُنھوں نے از راہِ مہربانی جلد ہی ملاقات کے کمرے میں طلب فرما کر پوچھا کہئے آپ کیا چاہتے ہیں؟

میں نے مختصر طور پر اپنا مقصد بیان کیا۔ اُنھوں نے تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ اِس قسم کے معاملات میں ہم بارگاہ قدس کے احکام کی پابندی کرتے ہیں۔ وہیں سے احکام نازل ہوتے ہیں۔ مگر میں اپنے اختیار تمیزی سے آپ کو صرف دو روز کے لئے دوزخ کی سیر کا اجازت نامہ دیدونگا اور ساتھ ہی وہ لباس بھی میرے پیشکار سے آپ کو مل جائے گا جس پر آگ کا کوئی اثر نہ ہوگا۔ اور آپ اطمینان سے جہنم میں چل پھر سکیں گے۔

میں نے نہایت ادب سے سر جھکا کر داروغہ صاحب کا شکریہ ادا کیا۔

اُنھوں نے مجھے رخصت کر دیا۔ کمرے سے نکلتے ہی ایک شخص مجھے اپنے ساتھ لے گیا اور ایک حریری لباس جو بہت ہی خنک تھا۔ مجھے پہنا کر ایک چھوٹا سا پرچہ میرے حوالہ کرتے ہوئے کہا اب آپ دوزخ کی سیر کر سکتے ہیں اہل دوزخ سے چند سوالات کرنے اور ان کی زندگی کے واقعات معلوم کرنے کی آپ کو اجازت ہے۔ مگر دُنیا میں پہنچ کر آپ انہیں مشتہر نہ کر سکیں گے۔

جناب! میں نے کہا جہاں آپ نے اتنی فیاضی کی ہے وہاں اتنی عنایت اور فرمائیے کہ میں دُنیا میں جا کر ان غریبوں کی داستان الم بیان کر سکوں۔ کیا آپ مجھے اِس کی اجازت اور دیں گے؟

نہیں بالکل نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ اِس سے نظام عالم میں برہمی پیدا ہو جانے کا احتمال ہے۔ قدرتی کارخانہ جس انداز سے چل رہا ہے وہ بدلا نہیں جا سکتا۔

بہت اچھا!

ایک خوبصورت اور زمردی پیرہن والا مقدس فرشتہ رہبری کے لئے میرے ساتھ ہو گیا۔ اور میں اُس کے پیچھے پیچھے اپنے لباس کو غور سے دیکھتا ہوا آہستہ آہستہ روانہ ہوا۔ دُور سے ایک بہت بڑا مکان نینی جیل سے ملتا جلتا نظر آیا اُس کے عالیشان اور سیاہ رنگ دروازہ میں بہت بڑا قفل لٹکا ہوا تھا۔ جو دوزخ کی دہکتی ہوئی آگ کی حدت سے سُرخ انگارہ ہو گیا تھا۔ دروازے کے سامنے ایک طویل القامت

انسان ہاتھ میں آتشیں گرز لئے کھڑا تھا۔ بار بار اُس کے مُنہ سے دہکتے ہوئے انگارے جھڑتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ اور جب ناک کے نتھنے پھُلا کر وہ سانس چھوڑتا تھا تو دھوئیں کی بل کھاتی ہوئی لہروں میں اُس کا مُنہ بالکل چھپ جاتا تھا۔ میرے مقدس رہبر نے اپنی ملکوتی زبان میں اس سے کچھ کہا۔ اِس نے نہایت مہیب انداز سے مجھے دیکھا اور اپنے شعلہ ریز گرز کی ایک زبردست ضرب سے دروازہ کا قفل کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی آتشِ سیال کا خوفناک سیلاب آیا میں آتشیں محلوں کے اس دِل ہلا دینے والے نظارے اور دھوئیں کے پیچ و تاب کو دیکھکر اتنا سہم گیا۔ کہ اندر جانے کا ارادہ ملتوی کر کے اپنے رہبر سے بولا معصوم اور حسین فرشتے یقیناً تم بہت رحمدل ہو خدا کے لئے مجھے واپس لے چلو! وہ اپنی لعلِ بدخشاں کو شرما دینے والی سُرخ اور چمکدار منقار کو کھول کر بولا۔ آپ ارادہ تبدیل نہیں کر سکتے۔ ورنہ اِس ملکوتی لباس کی توہین کا الزام عائد ہو جائے گا۔ جس کی سزا بہت سخت ہے۔ آسمانوں کی بلندیوں پر بدترین گناہ ارادے کی کمزوری اندرونی ہمتی ہے یہ گناہ کبھی نہیں بخشا جاتا۔

میں نے کہا آسمان کی فضاؤں میں اڑنے والے نیک دِل فرشتے میں ڈرتا ہوں کہیں جل نہ جاؤں!

انسان ہمیشہ سے ضعیف الاعتقاد واقع ہوا ہے۔ اُسے کبھی کسی بات پر اطمینان نہیں ہوتا۔ کیا تم نہیں جانتے تم کو جو لباس پہنایا گیا ہے

اُس پر آتش دوزخ کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ تم اس کو پہن لینے کے بعد دوزخ کی تمام خصوصیات حدت وسوزش سے محفوظ ہو۔
یہ سنکر میں نے ہمت کر کے ایک قدم بڑھایا میرا پیر گھٹنوں تک پگھلے ہوئے انگاروں میں ڈوب گیا۔ جو دوزخ کے دروازے سے بہ رہے تھے۔ اور یہ معلوم ہو رہا تھا کہ قریب ہی کوئی آتش فشاں پھٹ گیا ہے۔ جہاں سے یہ لاوا بہہ کر آرہا ہے۔ مگر میرے پیروں پر آگ کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اب مجھے اپنے لباس کے اعجاز پر پورا اعتماد ہوگیا اور دل میں کچھ حرارت پیدا ہوگئی میں بڑے اطمینان سے اپنے رہبر کی قیادت میں جہنم میں داخل ہوگیا۔ دوزخ کی وسیع اور تپتی ہوئی فضا میں ہر طرف چنگاریاں اُڑتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ اوپر نگاہ اُٹھا کر دیکھنے سے دور بہت دور ایک بڑا سا دہکتا ہوا انگارہ نظر آتا تھا۔ جو جہنم کی پوری وادی پر اِس طرح ڈھکا ہوا تھا۔ جیسے دیگچی پر رکابی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ کرۂ آفتاب کو خوب گرم کر کے دوزخ کے اوپر رکھدیا گیا ہے۔ جہنم کے بہت بڑے صحن میں مخصوص قسم کے کپڑے پہنے ہوئے بہت سے آدمی اِس طرح بھاگتے پھر رہے تھے۔ جیسے اوڈیس آبابا میں اطالوی بمباری کے وقت حبشی۔ اور غریب افریقیوں کے مظلوم گروہ کوئی شخص ایک منٹ کے لئے کھڑا نہ ہو سکتا تھا۔ جب کوئی دم لینے کی غرض سے ٹھہرتا تو اُوپر سے ایک ستارا ٹوٹتا اور فضا کو روشن کرتا ہوا نہایت تیزی سے سخت دھماکہ کے ساتھ اِس کے سر پر آگرتا قدم قدم پر دھماکوں کی آوازیں زمین دوزخ کو لرزہ براندام کر رہی تھیں

ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے دفعتہً ہزاروں طیارہ شکن توپیں چلا دی گئیں۔ مجھے اِن لوگوں سے گفتگو کرنے کا اشتیاق ہوا۔ میں نے یقین کر لیا کہ یہ درجہ سوئم یعنی سی کلاس کے دوزخی ہیں۔ اِس لئے اِن پر سخت قسم کا عذاب ہو رہا ہے۔ اور ایک لمحہ کے لئے سکون حاصل نہیں ہوتا۔ مجھے سی کلاس کے قیدیوں سے ہمیشہ ہمدردی رہتی تھی۔ اور میں نے بارہا تیسرے درجہ کے مسافروں اور سی کلاس کے قیدیوں کو مزید سہولتیں عطا کرنے کے مطالبوں کی تائید کی تھی۔ یہاں بھی قدرتاً پہلے مجھے انہیں سے ملنے کی خواہش ہوئی میں نے اپنے رہبر سے کہا میں اِن لوگوں سے کچھ بات چیت کروں گا۔

آپ کو اختیار ہے، فرشتہ بولا۔

میں نے آگے بڑھ کر ایک شخص سے پوچھا بھائی تم کون ہو؟

بس ایک بدنصیب دوزخی ہوں۔ اس نے آگ کی لپٹوں سے بچنے کی کوشش ناکام کرتے ہوئے کہا۔

مکان کہاں ہے تمہارا!

دوزخ میں!

دُنیا میں کہاں رہتے تھے۔

پرگنہ چائل میں!

پھر کس جرم پر دوزخ میں ڈال دیا گیا آپ کو!

جرم تو کوئی نہیں تھا۔ بات یہ ہے کہ یہاں سزا کی اپیل کا کوئی

رواج نہیں۔ ورنہ مجھے اپیل لکھنے میں کمال حاصل ہے مجھے اتنی ہی بات پر کہ میں نے ایک شخص کو قتل کے الزام میں گرفتار کر کے اُسے پھانسی دلا دی تھی یہاں بھیجدیا گیا۔

کیا قتل کا الزام سچّا تھا؟

الزام کے سچ اور جھوٹ ہونے کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں البتہ گواہ سب جھوٹے تھے۔

پھر تو یقیناً آپ کو بھی سزا ملنی چاہئے تھی؟

کیا آپ میرے لئے کچھ نہیں کر سکتے؟

بھائی میں تو ایک اخبار کا نامہ نگار ہوں مجھے صرف سیر کی اجازت دی گئی ہے۔

کیا داروغہ جہنم سے آپ کی ملاقات ہو سکتی ہے؟

جی ہاں ممکن تو ہے۔

پھر انہیں کچھ لے دے کر میرا عذاب ہلکا کرا دیجئے!

توبہ کیجئے توبہ جناب یہ جہنم ہے یہاں رشوت نہیں چلے گی!

بندہ نواز وہ بولے رشوت کہاں نہیں چلتی ہم نے تو دنیا میں ہر جگہ رشوت سے کام لیا۔ جہاں اُمید نہ تھی۔ کہ رشوت نہ چلے گی وہاں بھی یہ بہت کامیابی سے چلی بڑے بڑے فرشتہ سیرت اور پاک باز انسانوں کو ہم نے نماز کے مصلّے اور منبروں کی موجودگی کے سامنے رشوت دی ہے۔ وہ یہیں تک کہنے پائے تھے۔ کہ دفعتہً دھوئیں

کیا عرض کروں میرے مختصر واقعات یہ ہیں۔ کہ میں واعظ ہوں۔ ایک بہت بڑی عربی درسگاہ میں تعلیم پائی۔ فارغ التحصیل ہو کر وعظ و پند کو ذریعہ معاش بنایا۔ تصوف سے بھی لگاؤ تھا صوفیہ کے ہزاروں اقوال اور اشعار یاد تھے۔ جلد ہی مریدوں کا حلقہ وسیع ہو گیا۔ جس میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔

وہ مرید بھی سب آپ کے ساتھ ہوں گے۔ میں نے جلدی سے بات کاٹ کر پوچھا؟

نہیں جناب یہی تو شکایت ہے مجھے۔ میرے سب مرید جنّت میں ہیں۔ اور صرف مرید ہی نہیں میرا وعظ سُنکر جو لوگ منہیات سے بچے وہ بھی سب جنت میں بھیجدیئے گئے مختصر یہ کہ

ایک ہمیں پہ ہے عتاب سب کی خطا معاف ہے

پھر قبلہ آپ نے ایسا کیا قصور کیا تھا۔ کہ آپ کو تیسرے درجہ کے دوزخیوں میں اِس ذلّت کے ساتھ عذاب بھگتنے کو ڈال دیا گیا؟

قصور وصور کچھ بھی نہیں سب ذاتیات ہیں۔

ذاتیات! قبلہ کیا فرما رہے ہیں آپ عالمِ قدس میں اور ذاتیات؟

جی ہاں آپ سُنیں گے تو تعجب کریں گے۔ مجھے تو مجبوراً فیضی کا یہ مصرع دہرانا پڑتا ہے:

کا ایک طوفان۔ بیشمار چمکتی ہوئی چنگاریوں کو آغوش میں لئے آیا بالکل اس طرح جیسے دنیا کے میدانوں میں گرمیوں کے دنوں میں بگولے اٹھا کرتے ہیں۔ فرق یہ تھا۔ بگولوں میں پتے اور تنکے اُڑتے پھرا کرتے ہیں اور اُس میں دہکتے ہوئے انگارے اُڑ رہے تھے۔ دھوئیں کے اس غضبناک بگولے نے میرے اور اُن کے درمیان ایک حد فاصل قائم کر دی۔ میں ڈر کر پیچھے ہٹ گیا۔

تیسرے درجہ کے دوزخیوں میں مجھے ایک بزرگ صورت انسان کو دیکھ کر بہت تعجب ہوا مجھی۔ سفید نورانی ڈاڑھی۔ متوسط قد سُرخ و سُفید چہرہ۔ ماتھے پر سیاہ نشان۔ میں نے دل میں سوچا یہ تو جنت میں جانے کے قابل تھے۔ ممکن ہے کہ کارکنان قضا و قدر سے کچھ سہو ہو گیا ہو۔ میں نے اِن کے قریب جا کر سلام کیا۔ وہ معانقہ کے لئے بڑھے۔ مگر فوراً میرے اور ان کے درمیان دھوئیں کی ایک گاڑھی چادر حائل ہو گئی۔ رہبر نے کہا آپ دوزخیوں کے جسم کو مس نہیں کر سکتے میں دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اب وہ بزرگ پھر مجھے نظر آنے لگے۔ میں نے پوچھا حضرت آپ یہاں کہاں؟

کیا عرض کروں اُنھوں نے مُنہ بنا کر کہا۔

آخر کچھ تو فرمائیے۔

قدر دانیہائے عالمِ بالا معلوم شد!

میرے نامۂ اعمال کو دیکھکر کارکنانِ عالم بالا نے سب جرائم پر خطِ عفو کھینچ دیا۔ مگر شرک کے معمولی سے جرم میں جو آسمانوں پر بہت ہی مہیب سمجھا جاتا ہے۔ مجھے اِس دائمی عذاب میں مبتلا کر دیا گیا۔ میں نے بہت کہا رحم فرمائیے مگر آپ جانتے ہیں۔ شرک کا تعلق ذاتیات سے ہے۔ وہ کیونکر معاف ہوتا۔ بات صرف اتنی تھی کہ میں اپنے پیر و مرشد کو زندہ اور مختار جان کر مریدوں کو براہِ راست اِن کے مزار پر حاضر ہونے اور استمداد چاہنے کی ہدایت کیا کرتا تھا۔ بس ذاتِ وحدہٗ لاشریک نے اتنی سی بات پر ایسی زبردست سزا دیدی دیکھئے جناب اِسی لئے دُنیا کے اکثر دُور اندیش ڈکٹیٹر ہی اختیارات کے خلاف ہیں۔ حقیقتاً ایسی حکومتوں میں ذاتیات۔ حق و انصاف پر غالب آجاتی ہیں۔ وہ ابھی کچھ اور کہنا چاہتے تھے۔ کہ ایک آتشیں غبارہ زور سے اِن کے سر پر گرا اور وہ بیہوش ہوکر جہنم کی تپتی ہوئی زمین پر گر گئے۔

جہنم کے "دوسی" کلاس میں اِس سے زیادہ ٹھہرنا مناسب نہ تھا یہاں کی ہر چیز سے ویسی ہی عبرت اور وحشت برستی تھی جیسی دُنیا میں ہسپتالوں کے فری وارڈس کی چیزوں سے برسا کرتی ہے اور منتقلاً یہیں دوزخ ہے۔ غریب دوزخیوں سے بالکل اُسی طرح

ڈرتے ڈرتے دور کھڑے ہو کر بات چیت کرتے تھے۔ جیسے ڈاکٹر فری وارڈس کے غریب اور گندہ مریضوں سے چھوت کے خوف سے دُور کھڑے ہو کر پوچھا کرتا ہے۔ کہو بابا تمہارا کیا حال ہے۔

پھر وقت بھی کم تھا اور مجھے دوسرے طبقات کی سیر کا شوق بے چین کئے ہوئے تھا۔ میں نے اپنے رہبر سے کہا اب آگے چلئے! اس نے اپنے زمردیں پروں کو پھیلا کر ملکوتی زبان میں کہا میرا ایک پر پکڑ کر ہوا میں اڑنے کے لئے تیار ہو جائیے کیا جہنم کا دوسرا طبقہ "بی کلاس" کچھ بلندی پر واقع ہے؟

جی ہاں ہمیں چند فرسنخ اوپر کی جانب چڑھنا ہو گا! میں نے اپنے مقدس رہبر کے ایک ہلکے زمردیں پر کو داہنے ہاتھ کی دو انگلیوں سے تھام لیا۔ اس کے بعد یہ طائرِ قدس جہنم کی آتشناک فضا میں اپنے حسین پروں کی زمزمہ ریز آواز سے ترنم اور نغمے پیدا کرتا ہوا اڑا اس کی طاقتِ پرواز کا اندازہ کرنا سخت مشکل تھا۔ وہ زبردست عقاب کی طرح بجلی کی سی تیزی سے اڑ رہا تھا اور میں اس کے پروں کے نغمات شیریں سے لطف لے رہا تھا۔ اس کے پروں سے عہد الست کے گیت نہایت اونچے سروں میں بلند ہو رہے تھے۔ اور دوزخ کی آتش بار فضاؤں پر ایک وجدانی کیفیت اور ایک ملکوتی سکوت بالکل اس طرح چھاتا جاتا تھا جیسے برسات کے موسم میں کالی کالی گھٹائیں تیز اور ٹھنڈی ہوا کی

امداد سے آسمان پر پھیل جایا کرتی ہیں۔ اور آن کی آن میں سورج کی آگ برسانے والی شعاعوں کو سمیٹ کر زمین و آسمان کے درمیانی خلا کو فردوسی ٹھنڈکوں سے معمور کر دیتی ہیں ؎

تھوڑی ہی دیر میں ہم دوزخ کے دوسرے درجہ یعنی بی کلاس میں پہنچ گئے۔ میں نے اپنی انسانی حس سے فوراً محسوس کر لیا۔ کہ یہاں کا درجۂ حرارت پہلے طبقہ کے مقابلہ میں بہت کم ہے اور دونوں میں دھوپ اور سایہ کا فرق ہے۔ کاش مجھے معلوم ہوتا کہ میں جہنم کی سیر کرنے میں کامیاب ہو جاؤنگا۔ اور میں وہاں کے مختلف طبقات کا درجۂ حرارت معلوم کرنے کی غرض سے مقیاس الحرارت اپنے ساتھ لے آتا لیکن جس حد تک انسانی حواس اور اس کی امتیازی قوتوں کا تعلق ہے میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ پہلے اور دوسرے درجہ کی حرارت وحدت میں اتنا ہی فرق تھا جتنا آگرہ اور مالوہ کی گرمی میں ہو سکتا ہے۔ بس یوں ہی سمجھ لیجئے کہ دوسرے درجہ کے دوزخیوں کو جہنم میں خس کی ٹٹیوں کا لطف آرہا تھا۔ یہاں پہنچ کر میں نے دیکھا کہ اس طبقہ کے دوزخیوں کی حالت بھی پہلے درجہ والوں سے ذرا اچھی ہے عذاب بھی اتنا سخت نہیں ہے۔ مگر جہنم پھر جہنم ہے۔ یہ لوگ جس پانی کو کافی ٹھنڈا سمجھ کر پیتے تھے۔ وہ اتنا گرم تھا کہ میں اس سے کلی تو نہیں کر سکتا تھا۔ یہاں آنے کے بعد ہوش و حواس درست

ہوتے ہی مجھے چائے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ نہ معلوم کب سے
میں نے چائے نہیں پی تھی۔ اس احساس کے دماغ میں پیدا ہوتے
ہی میرے رہبر نے سمجھ لیا کہ میں کسی دنیوی طلب و خواہش میں
مبتلا ہوں اس نے فوراً اپنے پروں کو پنکھے کی طرح ہلانا شروع کیا
مجھے ایسا معلوم ہوا۔ گویا میں خس کی نہایت ٹھنڈی ٹٹیوں کے اندر بیٹھا
ہوا ہوں۔ جو برف کے پانی سے تر ہیں اور بجلی کے پنکھے تیزی سے چل
رہے ہیں غذا اور پانی نیز چائے وغیرہ کی تمام خواہشات معاً زائل
ہوگئیں میرے رہبر نے بتایا کہ جہنم کی کوئی چیز آپ کے لئے جائز نہیں
ہے۔ یہاں کی سب چیزیں عذاب میں داخل ہیں اور دنیا کے ان باغیوں
کے لئے مخصوص ہیں۔ جنہوں نے کسی نہ کسی طرح حکم ربانی کی خلاف
ورزی کی ہے۔ آپ کا نامۂ اعمال جو مجھے دکھایا گیا ہے۔ اب تک
بالکل بے داغ ہے۔ میں نے اپنے رہبر کا شکریہ ادا کیا اور طبقۂ ثانی
کا معائنہ شروع کر دیا۔ اس طبقہ میں ننگے جرائم پیشہ مقید تھے۔ جن میں
زیادہ تر فریب کار لیڈر۔ مذہب کے پردے میں گمراہی پھیلانے والے
رہنما پُر فریب طریقہ پر رجسٹرا اے اور بی میں رجسٹرڈ ہونے والے
اطبا اور دوا فروش اور اکثر بے ضمیر اخبار نویس تھے۔ جو ننگے پیر
دوزخ کی آبلہ ڈال دینے والی سطح پر چلتے پھرتے تھے۔ اور ملتہب
ہوا میں سانس لیتے تھے ان کے سر اور جسم پر کوئی بال نظر نہ آتا تھا۔
سب آگ کے شعلوں کی نذر ہو چکے تھے۔ میرے رہبر نے بتایا کہ یہ درجہ

اگرچہ نسبتاً پہلے درجے کے مقابلہ میں کافی سرد ہے لیکن پھر بھی اتنا گرم ہے کہ آپ اِس لباس کو اُتار دیں تو ابھی جل کر خاکستر ہو جائیں۔ صبح و شام یہاں اتنی گرم ہوائیں چلتی ہیں کہ دنیا کی بادِ سموم اِن کے سامنے بادِ نسیم کہی جا سکتی ہیں۔

دوسرے درجہ کے ایک جہنمی نے میرے پوچھنے پر اپنی داستان حیات یوں بیان کرنا شروع کی:

میں ہندوستان کے ایک مشہور صوبہ میں طبابت کرتا تھا۔ اگرچہ اِس فن کو باقاعدہ حاصل نہ کیا تھا۔ مگر میرے خاندان میں دو تین پشت اوپر ایک بہت بڑے طبیب گذرے تھے اسی مناسبت سے میں نے مطب کھول کر علاج معالجہ شروع کر دیا۔ تین چار مہینے کے اندر ہی میرے ہاتھ سے کافی مریض جنت النعیم کو سدھار گئے جو اب تک وہاں نہایت آرام سے مقیم ہیں۔ مجھ پر آسمانی حکومت نے یہ الزام لگایا کہ تم نے کئی سو جانداروں کو جس میں تمہاری والدہ اور چند لڑکیاں بھی شامل ہیں۔ قتل کیا۔ میں نے جواب دہی میں صرف اتنا ہی کہا کاش میں بھی کسی کے ہاتھ سے مر گیا ہوتا اور آج بجائے جہنم کے جنت میں دودھ اور شہد کی نہروں کے کنارے بیٹھا ہوتا۔ میرے ہاتھ سے جو لوگ مرے اِن کی دُنیا تو ضرور خراب ہوئی۔ مگر عاقبت سدھر گئی۔ اور یہ بڑا زبردست احسان ہے۔ مآل کار پر نظر رکھتے ہوئے مجھے معاف کیا جائے اور سزائے دوزخ کو منسوخ کر کے کم سے کم اعراف ہی بھیج

دیا جائے ممکن تھا کہ میری یہ التجا کارگر ہوتی لیکن ایک بوڑھی عورت اپنے کمسن اور اندھے بچہ کو گود میں لئے آئی اور آسمانی حکومت کی زنجیر عدالت کو ہلا کر اس نے استغاثہ کیا اور میرا نام پکار کر کہا کہ اس ظالم نے میرے معصوم بچہ کی آنکھیں تیز لوشن ڈال کر پھوڑ ڈالی تھیں۔ یہ استغاثہ فوراً ہی زیر سماعت آیا اور مجھے جو سزا دی گئی تھی بحال رکھی گئی مگر یہ بھی غنیمت ہے کہ دوسرا درجہ دیا گیا۔ اگر کہیں تیسرے درجہ میں ڈال دیا جاتا تو غضب ہی ہو جاتا میں اس درجہ سے صرف گذر کر یہاں تک آیا تھا۔ اسی درمیان میں شعلوں کے شدید التہاب اور ہوا کی ناریت سے جسم پر جو آبلے پیدا ہوئے تھے وہ آج تک باقی ہیں۔ اس کے بعد حکیم صاحب شاید آسمانی حکومت کے خلاف لب کشائی کرنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ دفعتہً آگ کا ایک شعلہ لرزاں بلند ہوا۔ اور زور سے ان کے منہ پر آ کر لگا۔ پھر سانس کے ذریعہ اندر داخل ہو گیا۔ یہ آگ اتنی روشن تھی کہ ان کے سینے اور پھیپھڑوں میں گشت کرتی ہوئی مجھے باہر سے صاف نظر آ رہی تھی۔

اسی درجہ میں بہت سے ادھورے اور علم و عقل کے اعتبار سے نابالغ حاکم۔ غلط اکسیر سے اور الٹی تشخیص کرنے والے ڈاکٹر امداد و رعایت کے پردے میں رشوت لینے والے افسران کرایہ کے ٹوٹی پھوٹی موٹروں کو پاس کر دینے والے ماہرین۔ اور ان موٹروں کے حریص مالکان۔ غلط پتوں پر خطوط تقسیم کرا دینے والے پوسٹ ماسٹر وغیرہ بھی

رکھے۔ مگر ان سب سے فرداً فرداً گفتگو کرنا نتیجہ خیز نہ تھا۔ مجھے صرف دوسرے درجہ کے معمولی حالات معلوم کرنا تھے اس لئے میں اپنے رہبر کے ساتھ آگے چل کھڑا ہوا۔ سامنے ہی ایک مکان تھا پختہ اینٹوں سے بنا ہوا۔ اوپر لوہے کی چھت تھی۔ اندر سے دھوئیں کے اژدھا بل کھاتے ہوئے نکل رہے تھے کبھی کبھی آگ کی سرخی بھی نظر آجاتی تھی جیسے کالے بادلوں میں بجلی چمک جایا کرتی ہے۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ ہم دنیا کے کسی ایسے مقام پر کھڑے ہیں۔ جہاں اینٹوں کا بھٹہ لگا ہوا ہے۔ اور لاکھوں اینٹیں بہ یک وقت پکائی جا رہی ہیں۔ میں حیرت سے اس مکان کو دیکھ رہا تھا۔ اور دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔ کہ اس کا مکین کون ہوگا۔ کہ دروازہ کھلا اور دھواں ایک بے پناہ بگولے کی طرح پیچ و تاب کھاتا ہوا نکلا پھر جاں سوز لپٹیں نکلیں۔ اس کے بعد ایک خوبصورت وجیہہ آدمی برآمد ہوا اور آتے ہی ڈانٹ کر بولا۔ خبردار اندر نہ آنا یہاں جگہ نہیں ہے مشکل سے ایک گز جگہ میں نے اپنے چھوٹے بھائی کے لئے روک رکھی ہے۔ اب میں کسی کو اندر نہ آنے دوں گا آگے جاؤ آگے۔

یہ حکم اس نے بالکل اس انداز میں دیا تھا۔ جیسے چھوٹے اسٹیشن پر تھرڈ کلاس میں بیٹھا ہوا کوئی مسافر دیہاتیوں کو مخاطب کرکے کہہ دیا کرتا ہے۔ یہاں جگہ نہیں آگے جاؤ!

حقیقت میں یہ ایک زمیندار تھے جو زیادہ مالگذاری وصول کرنے کی پاداش میں یہاں بھیجدیئے گئے تھے۔ دنیا میں اپنے چھوٹے

بھائی گو زمینداری کے کاموں میں اپنا قائم مقام کر کے آئے تھے اِن کو یقین تھا کہ وہ بھی ضرور یہاں آئیں گے اِس لئے دور اندیشی اور زمیندارانہ حرص کے خیال سے انھوں نے جہنم میں آنے والے ہجوم کا لحاظ کرتے ہوئے۔ اِن کے لئے جگہ محفوظ کر لی تھی۔

جہنم کے اِن دونوں طبقوں کی سیر میں میرا ڈیڑھ دن صرف ہو گیا تھا۔ اور اب چند گھنٹے باقی رہ گئے تھے۔ جن میں مجھے پہلا درجہ یعنی اے کلاس دیکھ لینا ضروری تھا۔ رہبر نے مجھے بتا دیا تھا۔ کہ سیر کے لئے جو وقت دیا گیا ہے۔ اِس سے زیادہ ایک لمحہ بھی یہاں گذر گیا۔ تو فوراً عذاب نازل ہونے لگے گا۔ میں بہت ڈرا اور جلد ہی تکمیل سیر کی فکر ہو گئی۔ چنانچہ میں نے طلائی منقار والے طائر حسین سے کہا کہ اب پہلے درجہ میں لے چلئے اِس نے پر پھیلا دیئے۔ اور میں نے پھر اِس کے ایک ٹھنڈے پر کو پکڑ لیا اِس میں ایک معصوم سا میلان پرواز پیدا ہوا۔ پر میں کو جنبش پیدا ہوئی اور آن کی آن میں وہ اتنا بلند ہو گیا۔ کہ دوسرا طبقہ مجھے آگ کا ایک دہکتا ہوا انگارہ معلوم ہونے لگا۔ نصف گھنٹہ کی تیز اور سریع پرواز کے بعد رہبر نے مجھے دوزخ کے بلند ترین طبقے یعنی اے کلاس میں پہنچا دیا۔ یہ مقام زیریں طبقات کے مقابلہ میں کافی خنک تھا۔ کبھی کبھی فضائے بسیط میں ستارے سے ٹوٹتے ہوئے نظر آجاتے تھے۔ جو بعض اوقات کسی کے سر پا جسم

کے کسی اور حصّہ پر گر پڑا کرتے تھے۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہاں صرف عشاق۔ شعراء اور چند ظالم بادشاہ۔ اکثر ناول نویس اور خاص خاص مقررین نظر بند ہیں۔ سطح پر تھوڑی دُور چلنے کے بعد ایک آشفتہ حال وارفتہ مزاج آدمی سے ملاقات ہوئی۔ میں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا آپ کا اسم شریف؟

فرمانے لگے زرینہ۔

زرینہ! کیا آپ عورت ہیں۔ میں نے ان کی داڑھی کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

نہیں۔ وہ بولے ویسے تو میں مرد ہوں۔ مگر

من تن شدم تو جان شدی، والا معاملہ ہے۔ بات یہ ہے وہ ذرا شرما کر بولے میں دنیا میں زرینہ پر عاشق تھا۔ یہ دل فریب عورت اور اس کا روح میں سما جانے والا نام میرے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکا ہے۔ اب میں اپنے آپ کو زرینہ ہی سمجھتا ہوں اور حقیقت میں میں زرینہ کے سوا کچھ ہوں بھی نہیں

میری رائے میں کم سے کم آپ کو تو یہاں نہ ہونا چاہیئے تھا کیونکہ میں یہیں تک کہہ سکا تھا کہ ملکوتی رہبر نے اپنے پروں کو پھیلا کر میرا منہ بند کر دیا۔ اور نہایت سہمے ہوئے انداز سے مجھے دیکھنے لگا۔ گویا آسمانی حکومت کے خلاف میرے منہ سے کسی لفظ کا نکلنا اُسے پسند نہ تھا۔ اور اِس میں کوئی شدید خطرہ تھا۔ میں نے روٹھے

سخن تبدیل کر کے پوچھا آپ پر الزام کیا تھا؟
کچھ نہیں بس یہی کہ میں زرینہ کی ذات میں خدا کا جلوہ دیکھنے کا عادی تھا۔ اور اسی کو باعث نجات جانتا تھا۔ آخر میں یہ الزام بھی لگایا تھا کہ میں زرینہ کو اپنی مادی محبت کا شکار بنا لینے کا آرزومند تھا۔

زرینہ اب کہاں ہے؟
جنت میں ہے۔ سنا ہے اُسے صرف اس وجہ سے کہ اس نے میری محبت کے سامنے سر نہیں جھکایا اور اپنی نسوانی خودداری کو قائم رکھا۔ جنت میں بھیج دیا گیا۔ دُنیا میں معمولی معمولی باتوں پر جب کسی کو خطاب مل جایا کرتا تھا۔ تو ہم نکتہ چینی کیا کرتے تھے۔ مگر آسمانی فیاضیوں کا بھی یہی عالم ہے۔
یہاں آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں؟
ہے کیوں نہیں!
کیا تکلیف ہے؟
زرینہ پاس نہیں بس یہی تکلیف ہے!
کیا دوزخ کی اور اذیتوں کے مقابلے میں یہ اذیت کچھ زیادہ روح فرسا ہے؟
بلاشک، میں کہتا ہوں۔ زرینہ میرے پاس آجائے تو جہنم بھی جنت میں تبدیل ہو جائے۔ پھر وہ اپنا منہ میرے کان کے پاس

لاکر آہستہ سے فرمانے لگے ۔ بھائی جنت کی طرف گذر ہو تو زرینہ سے میرا اسلام شوق کہہ دینا ۔ اور یہ بھی کہہ دینا کہ بڑی بیوفا ہو!
میں زرینہ کو پہچانوں گا کیسے؟ کوئی تصویر ہو تو دے دیجئے تصویر
آہ اِس کے لئے مجھے اپنا دِل پہلو سے نکالنا پڑے گا لیکن کیا تم ایسی حسین وجمیل عورت کو لاکھوں بدصورت عورتوں میں نہ پہچان سکو گے؟
بھائی جنت میں ایک زرینہ کیا ہزاروں حسین عورتیں ہوں گی!
نہیں زرینہ سے زیادہ خوبصورت جنت میں کوئی ہو ہی نہیں سکتی ۔ کاش تم اُسے میری آنکھوں سے دیکھتے!
اِن صاحب سے گفتگو کرکے میں بائیں جانب کو مڑا اور تھوڑی دور تک سیدھا چلا گیا ۔ جس قدر آگے بڑھتا جاتا تھا مترنم نغموں کی دلچسپ آوازیں میرے کانوں میں آتی جا رہی تھیں قریب پہنچ کر معلوم ہوا کہ جہنم کے اے کلاس میں ایک پُرلطف مجلس مشاعرہ منعقد ہو رہی ہے ۔ جس میں اکثر شعراء شریک ہیں اور بڑے سوز وگداز کے ساتھ اپنی اپنی مصنفہ مناجاتیں سنا رہے ہیں ۔ ایک صاحب نے بڑے جوش وخروش کے ساتھ مطلع پڑھا پہلا مصرعہ تو نعرہائے تحسین وآفرین میں دب کر رہ گیا ۔ دوسرا مصرعہ میں نے بھی سُنا جس کو شاعر خاص انداز میں پڑھ رہا تھا۔

پر شُو نگار رحمت کا وہ قصیدہ کہ ہنس پڑے کا عتاب ہیزا!
اکثر شعرا وہ تھے۔ جو شراب کی تعریف میں رنگیں اشعار کہا کرتے تھے۔ اور رندی و بیدینی پھیلانے کے عادی تھے۔ بعض شعرا بیویوں سمیت داخل جہنم کر دیئے گئے تھے۔ اِن کی زندگی بڑے مزے سے کٹ رہی تھی۔ کیونکہ جہنم میں۔

کسے را با کسے کارے نہ باشد

کی قید نہیں تھی۔ اِس درجہ کو میں اچھی طرح نہ دیکھ سکا۔ کیونکہ سارا وقت مشاعرہ میں ضائع ہو گیا۔ میرے رہبر نے اپنی یا قوتی رنگ کی منقار کھول کر مجھے جلد واپسی کا حکم دیا۔ مگر ایسا معلوم ہوا کہ میری بائیں جانب کی پسلیوں پر آگ سی دہک رہی ہے۔ میں نے گھبرا کر دیکھا۔ فوراً میری آنکھ کھل گئی۔ مسہری کے قریب ہی حقہ رکھا ہوا تھا جسے میرے دوست بڑی مصروفیت سے پیا کرتے تھے۔ کسی شریر بچہ نے اُسے گرا دیا۔ انگاروں سے بھری ہوئی چلم پلنگ پر اُلٹ گئی اور لحاف کو جلانے کے بعد میرے سوئیٹر تک پہنچی ہی تھی کہ میری آنکھ کھل گئی۔

پیشین گوئی

پیشین گوئی کا مرض خدا کسی کو نہ دے آدمی جب اس کا عادی ہو جاتا ہے تو اپنے دماغ کو "عرشِ اعظم" سمجھنے لگتا ہے اور "دِل پر

اُسے "جامِ جم" کا شبہ ہو جاتا ہے۔ ہر چیز کو "قلب و دماغ" کے زیر نگیں سمجھتا ہے اور زبان سے جو کچھ کہہ دیتا ہے۔ اُس کے ظہور پذیر ہونے کا ہر لمحہ بے چینی کے ساتھ منتظر رہتا ہے۔ اور اِس سے اختلاف کرنے والوں سے لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ روز آئے نئی نئی حماقتیں اِس سے سرزد ہوتی ہیں۔ طرح طرح کی باتیں کرتا ہے، نہ کسی کے نداق اور تمسخر سے متاثر ہوتا ہے نہ سزا و جزا سے ڈرتا ہے۔ اکثر اوقات اپنی بیوی اور بچوں کے لئے کوئی ایسی پیشینگوئی کر بیٹھتا ہے جس سے خود اِس کی جان آفت میں آ جاتی ہے۔ اور دو چار وقت روٹی بھی میسر نہیں ہوتی۔

یہ مرض اکثر ڈاکٹروں کو ہو جاتا ہے۔ خصوصاً جب اُن کی عمر چالیس سال سے اونچی ہو جاتی ہے۔ اور اپنی حذاقت و مسیحائی پر انہیں ضرورت سے زیادہ "حسنِ ظن" ہو جاتا ہے، ایسی حالت میں وہ مریضوں کو اپنی حماقتوں کا تختۂ مشق بنا لیتے ہیں طرح طرح کی اُن کے متعلق پیشین گوئیاں کرتے ہیں اور پھر تنہائی میں دُعا کرتے ہیں کہ ابھی ہم نے فلاں مریض کے لئے جو پیشین گوئی کر دی ہے۔ وہ غلط نہ ہو، ورنہ لوگ تیرے اِس گنہگار بندے سے بدگمان ہو جائینگے، اُدھر بے چارہ مریض جسکے متعلق وہ دق ہا سرسام یا ہسٹی یا موت کی پیشین گوئی کر چکے ہوتے ہیں۔ رات بھر جاگ کر دعائیں کرتا ہے کہ

خداوند عالم مجھے اِس بلا سے نجات دے، اگر دق ہوگئی تو میرے چھوٹے چھوٹے بچوں کی پرورش کون کرے گا، یا سرسام کی حالت میں بار بار کیونکر ڈاکٹر بلایا جائے گا۔ سر پر باندھنے کو برف کہاں سے آئے گا، بے ہوشی میں سنگھانے کو نخلخے کہاں سے نصیب ہوں گے، اور مر گیا تو کفن کا کیونکر بندوبست ہو گا؟ غرض اُسے تو طرح طرح کی فکریں ہوتی ہیں۔ مگر ڈاکٹر صاحب کو اپنی پشیمانی یا نیک نامی کے علاوہ کوئی خیال ہی نہیں ہوتا۔

اتفاق سے ہمارے ایک دوست جو بحیثیت ڈاکٹر عملی کام کر رہے تھے۔ اِس بیماری میں مبتلا ہو گئے۔ آدمی صورت و شکل کے اعتبار سے بھی اگر قابل نہیں تو جراح ضرور ہیں۔ اور مزاج بھی بہت اچھا ہے۔ بڑی ہنس مکھ اور ہمدرد ہیں۔ مگر عمر کی چالیس منزلیں طے کرتے ہی یہ عیب پیدا ہوگیا کہ مریض کا معائنہ کرتے ہی پیشین گوئی کر بیٹھتے ہیں۔ یہ بیماری بھی کبھی کبھی اتنی شدید ہو جاتی تھی کہ سیکڑوں مریض اِن کی پیشین گوئیوں سے تباہ رہتے تھے۔ کبھی شدت کم ہو جایا کرتی تھی۔ اور ہفتہ میں صرف ایک دو مریضوں ہی کو اِس مصیبت سے واسطہ پڑتا تھا۔

ایک مرتبہ ان کا لڑکا معمولی بخار کھانسی میں مبتلا ہو گیا۔ دو تین روز تک تو وہ اطمینان سے علاج کرتے رہے۔ مگر عوارض میں کمی نہ ہوئی تو اپنی بیوی کو الگ بلا کر آہستہ سے بولے۔

بیگم..... منّے کی سانس اکھڑ گئی ہے دو تین گھنٹے میں یہ ختم ہو جائے گا، اپنا سب کام کاج چھوڑ کر یہیں آ بیٹھو"..... وہ چولھے پر ہنڈیا رکھ کر اِس کے نیچے آگ جلا رہی تھیں خیال تھا کہ جلدی سے دال پکا کر روٹی سے فارغ ہو جائیں، ڈاکٹر صاحب نے منّے کے متعلق یہ "پیشین گوئی" فرمائی تو حیرت و استعجاب سے وہ اِن کا مُنہ دیکھنے لگیں، اِن کے حواس پراگندہ ہو گئے میاں دس بارہ سال سے قبرستان آباد کر رہے تھے۔ یہ تو شبہ بھی اِس وقت نہیں ہو سکتا تھا کہ غلط کہہ رہے ہیں۔ وہ ہنڈیا۔ روٹی کے دھندے کو چھوڑ چھاڑ دوپٹہ سے مُنہ ڈھانک کر، بیمار بچّہ کی پٹی پر جا بیٹھیں اور چپکے چپکے روتی رہیں۔ بار بار اپنے لختِ جگر کے مُنہ سے رضائی کا پلّہ ہٹا کر اُس کے ماتھے پر ہاتھ پھیر کر دیکھتیں کہ گرم ہے یا ٹھنڈا ہو گیا۔ کبھی سینہ اور پیٹ پر ہاتھ رکھ کر سانس کی حرکت کو محسوس کرتیں کبھی مُنہ پر مُنہ رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر روتیں..."منّے اپنی نصیبوں جلی ماں کو اکیلا چھوڑ کر تم کہاں چلے؟ عید کے کپڑے تو ایک دفعہ اور پہن لئے ہوتے!"

سخت پریشانی میں رات بسر ہوئی۔ بیگم کو ہر لمحہ یہی گمان ہوتا تھا کہ منّے کی سانس بند ہو گئی، اِس کا جسم ٹھنڈا ہو گیا خدا خدا کر کے صبح ہوئی تو ذرا اُون کی عقل ٹھکانے آئی، سمجھیں دو تین گھنٹے میں مر جانے والا بیمار اگر رات بھر زندہ رہ جائے تو سمجھو خدا اُسے اچھّا ہی کر دیگا۔

انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو جگا کر کہا "ذرا منّے کو اب تو دیکھو اکیا حال ہے اُس کا۔ میں تو سمجھتی ہوں اب خدا کا فضل ہو جائے گا"۔

ڈاکٹر صاحب بھی رات بھر بے چین رہے تھے۔ کچھ تو بچہ کا خیال کچھ بھوک کی تکلیف، نیند آتی تو کس طرح بس مسہری پر پڑے کروٹیں ہی بدلتے رہے تھے، فوراً اُٹھے اور جھک کر پہلے منّے کو نگاہوں سے دیکھا پھر سینہ کو انگلیوں سے ٹھونکا۔ پھر نبض دیکھ کر کہنے لگے "پہلے سے تو کچھ اچھا ہے۔ مگر بالکل اطمینان ابھی نہیں کیا جا سکتا۔

بیگم کی بدحواسی میں ذرا سی کمی ہوئی اور اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رونا دھونا بند کر کے اب وہ دعاؤں میں مصروف ہو گئیں۔ چائے کا وقت ہوا اور ڈاکٹر صاحب نے رات بھر کے روزے کو چائے کی پیالی پر افطار کرنا چاہا۔ مگر بیگم نے صاف کہہ دیا میرے جی کو جب تک بالکل اطمینان نہ ہو گا۔ اس وقت تک میں منّے کی پٹی نہ چھوڑوں گی، ڈاکٹر صاحب مایوس ہو کر باہر چلے گئے اور بارہ بجے تک مطب میں بیٹھے رہے۔ اِس درمیان میں چند بار وہ اندر آئے کبھی تو منے کو دیکھتے اور کبھی اُس کے حیلے سے چولہے کو دیکھتے، مگر چولہا ٹھنڈا پڑا تھا۔ بیگم نے منہ بھی نہیں دھویا تھا، اُن کے لئے پانی بھی حرام ہو گیا تھا ڈاکٹر صاحب آتے اور بچے کی نبض دیکھ کر کنکھیوں سے چولھے کو دیکھتے ہوئے چلے جاتے آخر دو بج گئے۔ اور اُن کی آنتیں قل ہو اللہ پڑھنے لگیں۔ بھوک سے

جان نکلنا شروع ہو گئی کھانا کھائے پورے دو وقت گذر گئے تھے۔ جو شخص دن میں چار مرتبہ کھانے کا عادی ہو وہ ایک دفعہ بھی نہ کھائے۔ تو سمجھ لیجئے کیا حال ہو گا؟ اِن کا سر چکرانے لگا۔ اور ہاتھ پیروں میں تشنج شروع ہو گیا۔ دِل ہی دِل میں اُنھوں نے کہا روٹی نہیں تو چائے ہی مِل جاتی"! مگر ملتی کیونکر بیگم تو بیٹے کے پاس سے اُٹھنے والی اسامی تھی ہی نہیں، اور خود اُنھوں نے کبھی یہ کام کیا نہ تھا، آخر اس کی ترکیب اُنھوں نے یہ نکالی کہ منے کا سینہ وغیرہ دیکھ کر کہا۔ بیگم اب کوئی اندیشہ نہیں رہا، بچہ خدا کے فضل سے بالکل اچھا ہے لو مُنہ ہاتھ دھو کر کم سے کم چائے تو پکا ہی لو۔

اُنھوں نے آنکھ میں آنسو بھر کر شوہر کو دیکھتے ہوئے کہا میرا تو کسی چیز کو جی نہیں چاہتا"!

"نہیں بیگم، دیکھو تین بج گئے تم نے کل سے کچھ نہیں کھایا نصیب دشمناں تمھیں کوئی تکلیف ہو گئی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ تم ویسے ہی اختلاج کی مریض ہو اگر کہیں بھوک کی تکلیف سے دورہ پڑ گیا تو بڑی مصیبت ہو گی"!

"مصیبت ہو گی تو ہوا کرے میں اکیلی دُنیا میں رہ کر کیا کروں گی؟ میرا لاڈلا بیٹا ہی جا رہا ہے۔ تو میں رہ کر کیا کروں گی۔

"توبہ کرو بیگم توبہ! کیوں فضول ایسی باتیں کرتی ہو۔ تمہارا بیٹا

بالکل اچھا ہے!"
"بالکل اچھا ہے؟
"ہاں اب کوئی خطرہ نہیں!"
"قسم کھاؤ سچ کہتے ہو!"
"تمہاری جان کی قسم بالکل سچ کہتا ہوں۔ تم اُٹھو۔ چائے پکا کر لاؤ۔ منّے کو بھی اسوقت چائے ہی دی جائے گی!"

یہ سنتے ہی بیگم اُٹھیں اور منٹوں کا کام لمحوں میں ختم کر کے، چائے پکا کر لائیں، تینوں نے بیٹھکر چائے پی۔

منّے چائے پیتے ہی رضائی پھینک کر کھڑا ہو گیا۔ ماں نے بہت روکا، مگر طبیعت اچھی تھی۔ بخار اتر چکا تھا۔ وہ نہ مانا۔ اور بستر چھوڑ کر گھر میں کھیلنے کودنے لگا، ماں کے جسم میں سیروں خون بڑھ گیا وہ بچہ کی طبیعت بحال دیکھ کر خوشی سے جامہ میں پھولی نہ سماتی تھی۔

جس دن بچہ کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ دو تین گھنٹہ میں مرجائے گا۔ اُسی روز صبح کو ان کے ایک بے تکلف دوست جو خوبصورت اور نازک اندام ہونیکے باوجود "خانصاحب" واقع ہوئے تھے، آنکھوں کی تکلیف سے بے چین ہو کر، علاج کی غرض سے آئے خانصاحب کے ڈاکٹر صاحب سے بڑے گہرے مراسم تھے۔ اُنھوں نے بڑی توجہ سے آنکھ کو دیکھا بار بار پپوٹے لوٹ کر اِن کا معائنہ کیا، پھر ایک آنکھ بند کرا کر خانصاحب کی کھلی ہوئی آنکھ کے سامنے

انگلیاں نچاکر پوچھا "بتاؤ کے ہیں؟"
خانصاحب مداری کے بندر تو تھے نہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی انگلیوں کے اشاروں پر ناچتے، وہ اپنی دانست میں ایک معمولی سی شکایت لیکر آئے تھے اور خیال تھا کہ ڈاکٹر صاحب کوئی اچھی دوا ڈالدیں گے۔ جس سے دو چار گھنٹہ میں آرام ہو جائے گا۔ مگر اُنھوں نے خلاف امید یہ کام شروع کر دیا تو خانصاحب کو بہت غصّہ آیا اور بگڑ کر بولے، پاگل ہو گئے ہو ذرا سی بات کا بتنگڑ بنا رہے ہو۔ میں کوئی اندھا ہوں!"
"خفا کیوں ہوتے ہو؟ تمہاری آنکھ میں موتیا بند ہو جانے کا اندیشہ ہے!"
"موتیا بند، احمق ہیں آپ"، خانصاحب نے ڈاکٹر صاحب کا ہاتھ آنکھوں سے ہٹاتے ہوئے کہا۔
"احمق ہم نہیں ہیں۔۔ تم ہو۔۔ دو سال کے بعد انشاء اللہ" "تمہیں موتیا بند ہو جائے گا"! ڈاکٹر صاحب نے پورے وثوق سے ذرا خفگی کے ساتھ کہا، اور غالباً انشاء اللہ کا لفظ اُنھوں نے خانصاحب کے لفظ "احمق" کا انتقام لینے کی غرض سے استعمال کیا۔
انشاء اللہ تم شام تک مر جاؤ گے"! خانصاحب نے جلکر کہا اور وہاں سے اُٹھ کر سیدھے ہمارے پاس آئے دور ہی سے ہمیں دیکھکر بولے "لو یار ہمیں تو موتیا بند ہو گیا"!
ہم خانصاحب کی طبیعت سے واقف تھے۔ انہیں روزانہ نئی نئی

بیماریاں لاحق ہوا کرتی تھیں۔ دو دن کھانسی آتی رہی تو تیسرے دن وہ ضرور کہہ دیا کرتے تھے پھیپھڑے خراب ہو گئے ہیں آنکھوں میں ذرا پیلاپن محسوس ہوا اور فوراً انھوں نے حکم لگا دیا ہیں "یرقان" ہو گئی، غرض وہ محمود ڈاکٹر صاحب سے زیادہ پیشین گوئی کے مریض تھے، چنانچہ ہم نے ان کی اس عادت کو ملحوظ رکھتے ہوئے بے پروائی سے کہہ دیا.. خدا رحم کرے!

"خدا رحم کرے... بس اور تم کچھ نہ کرو، خدا کی قسم ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے.. دو سال کے بعد موتیا بند ہو جائے گا۔ ذرا غور سے آنکھیں دیکھو اور کوئی معقول بندوبست کرو۔"

ہم نے قریب بلا کر خانصاحب کی آنکھیں دیکھیں ہماری رائے میں معمولی آشوب کے علاوہ کوئی بات نہ تھی۔ چنانچہ ہم نے کہدیا آپ بالکل اچھے ہیں" مگر انہیں یقین نہ آیا بولے۔ اچھے کیسے ہیں جی ڈاکٹر نے کہا ہے خوب دیکھ بھال کر"

"کہا ہوگا!

"تم کیا کہتے ہو... اچھی طرح دیکھو"

"میں دو سال پہلے کی بات نہیں بتا سکتا"

"پھر حکمت کیوں کرتے ہو؟"

"یونہی پیٹ بھرنے کو!"

"پیٹ یوں ہی بھرنے کو، اس کے لئے عقل کی ضرورت ہے۔

" ایسی عقل میں نہیں چاہتا جو دو سال پہلے ہی آدمی کو اندھا بنا دے!"

" کیا واقعی میں اچھا ہوں؟"

" بالکل اچھے ہیں آپ!"

" اچھے ہیں، پھر وہی!"

" بہت بہتر، پھر اچھے نہیں ہو سمجھ لو ہو گیا موتیا بند!"

" تم تو مذاق کرتے ہو!

" مذاق کرنے کا موقع تم ہی دیتے ہو!"

" دیکھو، خوب دیکھ کر کہو؟"

" خوب دیکھ لیا؟"

" تو نہیں ہے موتیا بند!"

" بالکل نہیں؟"

" نہیں جی ضرور ہے جبھی تو ڈاکٹر نے کہا ہے۔

" اچھا تو سمجھ لیجئے ہے۔ اور اِس کا علاج اپریشن کے سوا اور کوئی نہیں ہے!"

" اپریشن تو میں نہیں کراؤنگا!

" نہیں کراؤ گے تو اچھے بھی نہیں ہو سکتے!"

" اپریشن سے آنکھ جاتی رہے گی؟"

" آنکھ تو یوں بھی جائے گی!"

" تمہاری ہی جائے گی تم ہی اندھے ہو جاؤ گے!"

"خانصاحب یہ کہتے ہوئے یہاں سے بھی رخصت ہوئے؟"
اور سیدھے گھر پہنچے۔ دنیا میں اِن کے تین ہی راز دار تھے۔ ایک ڈاکٹر، دوسرے تم، تیسرے بیوی۔ دو سے مایوس ہو چکے تھے بیوی سے مشورہ کرنا باقی تھا۔ گھر پہنچتے ہی بیوی سے پوچھا۔

"کیا کر رہی ہو؟
کچھ نہیں چھالیہ کاٹ رہی ہوں!
ذرا اِدھر تو آؤ!
ٹھہرو آتی ہوں!
جلدی آؤ جی!
کیوں ایسی جلدی کیا ہے کہیں جا رہے ہو کیا؟
تم نے سوالات شروع کر دیئے یہاں جان پر بن رہی ہے اور تم کو چھالیہ سے فرصت نہیں!

وہ سمجھیں کوئی حادثہ پیش آگیا ہے۔ فوراً دوڑی ہوئی آئیں اور بیٹھتے ہوئے بولیں کیا ہوا خیر تو ہے؟
خیر و یر کیا ہے موتیا بند ہو گیا ہمیں!
خانصاحب نے بڑی مایوسی کے ساتھ آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ "موتیا بند"۔ وہ گھبرا گئیں اور مسلسل پوچھنا شروع کیا۔

موتیا بند؟
کیسے ہو گیا؟

بخار بھی تو نہیں ہے ہاتھ پیر تو بالکل ٹھنڈے ہیں تمہارے!
خدا نہ کرے جو موتیا بند ہو تمہیں! کیسے ہو گیا؟ کس نے کہا؟؟
نہیں ہو گیا ڈاکٹر صاحب نے آنکھیں دیکھ کر بتایا ہے اب وہ سمجھیں کہ موتیا بند کوئی آنکھ کی بیماری ہے۔ اب تک تو خیال تھا کہ کوئی بخار کا بھائی ہو گا۔ موتیا بند! اسی لئے انھوں نے خالصاحب کے ہاتھ پیر ٹٹول کر دیکھے تھے، انھوں نے غور سے خالصاحب کی آنکھیں دیکھیں مگر کچھ معلوم نہ ہوا، پوچھا۔ موتیا بند ہے کیا بلا؟
آنکھوں میں پانی اتر آتا ہے، اور آدمی اندھا ہو جاتا ہے
خدا نہ کرے جو تم اندھے ہو!
ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں ابھی تو نہیں ہے۔ دو سال کے بعد ہو جائے گا"
خدا نہ کرے.... انہیں کو ہو گا انشاء اللہ وہی اندھے ہونگے اُنہیں کے کوڑھ پھوٹے گا، وہی لولے لنگڑے ہونگے!
کیوں فضول کوس رہی ہو ان کی کیا خطا ہے اُنھوں نے دوستانہ مشورہ دیا ہے کہ ابھی سے کچھ انتظام ہو جائے، مگر سنتی ہو حکیم صاحب کہتے ہیں کچھ نہیں ہے؛
چولھے بھاڑ میں جائیں ایسے دوست، خدا موت دے ان دوستوں کو! بس حکیم صاحب ہی ٹھیک کہتے ہیں۔ اللہ انہیں زندہ رکھے اور خدا اُسے غارت کرے یہ ڈاکٹر تو ایسے ہی واہی

تب ہی بکا کرتا ہے۔ پرسوں اس نے لونڈے کے لئے بھی تو کہہ دیا تھا کہ دو گھنٹے کے بعد مر جائے گا۔ رات بھر بیوی بیٹھی روتی رہی۔ صبح کو خود ہی کہدیا..... اچھا ہو گیا اس دیوانے کا اعتبار ہی کیا؟

"اچھا لونڈے کو بھی کہدیا تھا مر جائے گا،" خانصاحب نے تعجب سے پوچھا،

ہاں پرسوں ہی کا تو ذکر ہے؟ پٹھانی نے جواب دیا۔

اب خانصاحب کو یقین آگیا کہ انہیں موتیا بند نہیں ہوگا یہ محض ڈاکٹر صاحب کی حماقت ہے؟ کہ شبہ میں ڈالدیا اور یہ حماقت غالباً اُن کی عادت میں داخل ہے۔ چنانچہ وہ ڈنڈا لیکر اُٹھے۔

دیکھو کہیں لڑ مت بیٹھنا۔ پٹھانی نے کہا۔

تم لڑنے کو کہتی ہو۔ میں اس کی جان لئے بغیر نہ چھوڑوں گا۔

وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھیں۔ لیکن خانصاحب تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے چلے گئے۔

ڈاکٹر صاحب باہر ہی بیٹھے ہوئے تھے، خانصاحب نے جاتے ہی پوچھا۔ کیا کہا تھا تم نے میرے لئے!

"میری رائے میں تم کو دو سال کے بعد موتیا بند ہو جائے گا اور تم اندھے ہو جاؤ گے۔ اور تمہیں ہیضہ ہو جائے گا تم مر

جاؤگے کل دن نکلنے سے پہلے ہی"

"حواس بھی درست ہیں آپ کے؟

دیکھو جی! ذرا زبان کو قابو میں رکھا کرو نہیں تو ساری ڈاکٹری کرکری کردونگا، جاہل، احمق، بیوقوف، ہم نے تو مارے افسوس کے صبح سے پان تک نہیں کھایا اور تم ہو۔ کہ حقّہ کے دم پر دم لگائے چلے جارہے ہو۔ اور پھر کہتے ہو حواس تو درست ہیں آپ کے

خانصاحب خفا ہوئے کی بات نہیں میری سمجھ میں جو بات آئی میں نے بتادی! تم کیا اور تمہاری سمجھ کیا، دیکھو آئندہ کسی کے لئے ایسی بات مُنہ سے مت نکالنا۔ نہیں تو کوئی ایسی مرمت کریگا کہ عمر بھر یاد رکھوگے۔

اچھا معاف فرمائیے غلطی ہوئی!

کیوں ہوئی؟ تمہیں میرے متعلق غلطی کرنے کا کیا حق ہے غلطی کیا کرو اپنے، اپنی بیوی اور بچہ کے لئے میرے لئے غلطی کرنے کے تم مجاز نہیں ہو!

بہت اچھا اب خیال رکھوں گا۔

مگر اب تو غور سے آنکھ کو دیکھ کر بتاؤ موتیا بند تو نہ ہوگا۔

ڈاکٹر صاحب نے دوبارہ آنکھ کو دیکھ کر کہا۔ کچھ شبہ تو ہے مگر پہلے سے کم!

میں اس کو نہیں مانتا صاف کہو نہیں ہوگا۔ ورنہ یاد رکھو میں

ڈاکٹری کرنا بھلا دونگا۔
ڈاکٹر صاحب بہت گھبرائے، خانصاحب کے تیور واقعی خراب تھے، اور اندیشہ تھا کہ انہیں مطمئن نہ کیا گیا۔ تو چوٹ کئے بغیر نہ مانیں گے۔ چنانچہ مجبوراً انہیں کہنا پڑا۔
"آنکھ بالکل اچھی ہے، اب کوئی شکایت نہیں!
قسم کھاؤ۔
آپ کے سر کی قسم!
میرا سر مفت کا نہیں ہے۔
آپ کی جان کی قسم!
کیوں مجھے بے وقوف بنائے جاتے ہو جی، اپنی جان کی قسم کھاؤ!
بھائی خدا کی قسم کھاتا ہوں تمہیں موتیا بند نہ ہوگا۔
پہلے کیوں جھک مارا تھا۔
غلطی ہوگئی تھی۔
اب تو غلطی نہیں ہو رہی، ذرا سوچ سمجھ کر کہو۔ اگر خدانخواستہ کہیں ہوگیا۔ تو جان کی خیر نہیں تمہاری!
واللہ اب بالکل اندیشہ نہیں ہے!
لعنت ہے تمہاری عقل اور سمجھ پر۔ . خانصاحب نے مطمئن ہو کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے فرمایا۔

تعزیت

عیادت اور تعزیت میں وہی فرق ہے جو نوٹس اور وارنٹ میں، لیکن پھر بھی عیادت اور تعزیت بعض اوقات ایک ہو جاتی ہے۔ عام لوگ بیمار پرسی اور تعزیت کے باریک فرق کو بہت کم سمجھتے ہیں، اسی لئے اُن دونوں الفاظ کو مترادف المعنی خیال کرتے ہین، مگر اِسی قسم کے حضرات جو میں نے عرض کیا اور میں نے فرمایا کے باہمی تفاوت کو نہیں سمجھتے ہیں، ذرا اِس حماقت کا تصور کیجیے جب آپ کا کوئی عزیز سخت بیمار ہو، موت وحیات کے پلڑے بالکل برابر ہوں، کبھی یہ جھک جاتا ہو کبھی وہ، ایسی حالت میں آپ کے کوئی مہربان آئیں اور اپنے ملکی لب ولہجہ میں دریافت کریں۔

کہئیے اب کیا حالت ہے صاحبزادے کی؟

مجھے تو رات بھر الجھن رہی دِل کو دِل سے راہ ہوتی ہے، ہر وقت بچہ کا خیال رہا!

صبح ہی دفتر جانا تھا اِس لئے آگیا کہ راستہ میں آپ کے یہاں تعزیت کرتا ہوا چلا جاؤں گا،

ذرا الفاظ تو دیکھئے اُس وقت اُنکی جہالت یا حماقت سے آپ کو کیسی تکلیف پہونچے گی۔ بار بار یہی طبیعت چاہے گی کہ

ان کا منہ نوچ لیا جائے یا اچھی طرح گوشمالی کر دی جائے، کچھ بھی نہ ہو سکے تو دو چار جھڑکیاں دے کر ہی گھر سے نکال دیا جائے مگر یہ تو کچھ بھی نہ ہوگا نہ آپ کی اخلاقی جرات کا یہ تقاضا ہوگا کہ انھیں عیادت اور تعزیت کا مفہوم سمجھا دیں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا رہیں گے اور جب تک جیتے رہیں گے اپنے دوستوں کو اس "جہل مرکب" سے نقصان رنج اور صدمہ پہنچاتے رہیں گے۔

بات یہ ہے کہ عیادت اور تعزیت میں فرق بھی تو صرف اتنا ہی ہے کہ عیادت میں گفتگو ہوتی ہے براہ راست بیمار سے اور تعزیت میں اس کے اعزا سے بس یوں سمجھ لیجئے کہ عیادت اور تعزیت کا معاملہ بالکل دعوت اور فاتحہ کا سا ہے، دعوت میں کھانا بلا واسطہ کھانے والے کے پیٹ میں پہونچ جاتا ہے اور فاتحہ میں غذا تو جاتی ہے کھانے والوں کے پیٹ میں، صرف "ثواب" پہونچتا ہے اس غریب کی روح کو جس کے اعزاز میں یہ کھانا پکایا گیا ہے۔

عیادت اور تعزیت کی رسم ہندوستان میں ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ بظاہر تو عیادت بڑی ہمدردی، خلوص اور محبت کی علامت ہے۔ مگر کبھی اس محبت اور خلوص سے ناک میں دم آجاتا ہے خصوصاً اس وقت جبکہ مریض مبتلا ہو اسہال یا ہیضہ میں ایسے

بھی جس انداز سے عیادت کی جاتی ہے وہ دس فی صدی بیماروں کو ہلاک اور بقیہ ۹۰ فی صدی کو زندہ در گور ہی بنا دیتا ہے، آدمی کیسا ہی فربہ اور تندرست ہو پوچھنے والے کی خصوصیت اور یگانگت کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ اِسے بالکل "مردہ" ہی ظاہر کرے اور عیادت کے وقت اِس قسم کے جملے استعمال کرے کہ بیمار اچھا بھی ہو چکا ہے تو اپنی بیماری کے تصور سے پھر بیمار ہو جائے چنانچہ اچھا خاصا پڑھا لکھا ہندوستانی بھی مریض کے سرہانے پہونچکر جس قسم کے جملے اور الفاظ استعمال کرتا ہے ان میں اُمید کی روشنی تو ہوتی ہے کم اور یاس کی تاریکی بہت زیادہ ہوتی ہے مثلاً۔

اِس علالت نے تو تم کو بالکل نیم جان کر دیا!

تم تو بڑے دُبلے ہو گئے!

آنکھوں میں حلقے پڑ گئے!

پہلی سی قوت تو شاید اب عمر بھر آپ کے جسم میں نہ آسکے گی۔

آخر قوت مسلب نہ ہوتی تو کیا ہوتا۔ بخار کیا تھا بس قیامت تھی"۔

ہر وقت غافل ہی رہتے تھے۔

بس یوں سمجھئے نئی زندگی ملی، ورنہ نصیب دشمناں مرنے میں کسر ہی کیا رہی تھی۔

حکیم صاحب نے بلا مبالغہ تمھارے علاج میں ملک الموت سے کشتی لڑی ہی!

رہی نفرت تو ظاہر ہے کہ جب عیادت کا یہ حال ہے تو تعزیت تو پھر تعزیت ہے، اور جناب یہ ہے ہندوستان جہاں بڑے بڑے اہل فن بھی المیہ ڈراموں میں محبوب کی خودکشی کے حادثہ پر محروم و مہجور عاشق کو اس کے سرہانے بٹھا کر بڑے قاعدے تال اور سُر کی جملہ قیود کے ساتھ ہارمونیم اور دوسرے بہجت انگیز باجوں پر بجائے نماز پڑھنے کے یہ غزل گانے کی اجازت دیدیتے ہیں۔

جاؤ سدھارو میری جان تم پہ خدا کی ہو اماں
بچھڑے ہوئے ملیں گے پھر قسمت نے گر ملا دیا

پھر ایسا اہل دِل تعزیت کے سلسلہ میں کیا کسر اٹھا کر رکھے گا، چنانچہ عموماً یہی ہوتا ہے کہ جب کسی کے مرنے کی اطلاع ملتی ہے تو فوراً تعزیت کے لئے عربی اور فارسی کے اشعار اور جملے سوچنا شروع کر دیئے جاتے ہیں بڑی کوشش سے ذہن پر زور دے کر ایسے اشعار اور جملے حافظہ سے نکالے جاتے ہیں جو اِسی موقع کے لئے موزوں ہوں اور اُنھیں دوران گفتگو میں کسی طرح پڑھ دیا جائے کہ سننے والوں پر اثر بھی ہو اور اپنی قابلیت کا سکہ بھی بیٹھ جائے حالانکہ جب کسی کے یہاں کوئی مر جاتا ہے تو اسے نہ تو فارسی کے اشعا

اور جملوں سے تسکین ہوتی ہے، نہ فلسفیانہ اور منطقی دلائل سے، اگر کچھ سکون ہوتا ہے تو بس رونے سے اور ایسے تعزیہ دار کم ہوتے ہیں جو کسی کا دل بہلانے کی غرض سے اس کے ساتھ رونا بھی شروع کر دیں یا بولیں کم روئیں زیادہ، برخلاف اس کے تعزیت کرنے والوں میں نوے فی صدی ایسے ہوتے ہیں جو صرف برمحل اشعار برجستہ جملے اور موزوں آیات پڑھنے کی غرض سے آتے ہیں اور اپنا یہ اخلاقی، انسانی یا مذہبی فرض ادا کرنے میں بڑی جگر کاوی اور دماغ سوزی سے کام لیتے ہیں، ایک کہتا ہے۔

کل نفس ذائقۃ الموت!

دوسرا بول اٹھتا ہے۔ صبر کیجئے، ان اللہ مع الصٰبرین تیسرے صوفیانہ انداز میں ارشاد فرماتے ہیں، اللہ بس باقی ہوس!

چوتھے صاحب دنیا کی بے ثباتی کے اظہار میں کہتے ہیں۔ قزاق

اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارہ!

پانچویں بیت بازی کے اصول پر ادھر ادھر دیکھ کر گویا ہوتے ہیں۔

دیکھئے سب چیزیں پڑی رہ گئیں، کوئی بھی ساتھ نہ گئی

کس قدر صحیح کہا ہے شاعر نے ؎

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا!

چھٹے جن کا ذوق شاعری اور مذاق سخن ذرا بلند ہوتا ہے

بطور رجز ارشاد فرماتے ہیں،

زندگی کیا ہے عناصر کا ظہور ترتیب
موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

پھر سانس لئے بغیر، سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں۔

موت ہے زندگی کا اک وقفہ
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

یہاں تک تو غنیمت ہے لیکن تعزیت کرنے والوں میں ایسے بزرگ بھی ہوتے ہیں جو شعر پڑھنے اور اُس کے سمجھنے کو لازم و ملزوم نہیں سمجھتے.... اور ہم تو کہتے ہیں شعر کہنا اور اس کا سمجھنا دونوں الگ الگ چیزیں ہیں کیا ضروری ہے کہ ایک شاعر جو روانی اور آمد کے جوش میں یہ مطلع کہہ دے۔

صید افگن جب ہے عین الکروپیدا
مور کی منقار سے لا تقنطو پیدا

وہ اِس کے سمجھنے یا سمجھانے پر بھی مجبور ہو، جبکہ سمجھا ہے اور موت ایک مشہور اور سچی ضرب المثل ہے۔ اِس قسم کے لوگ جب کسی تعزیتی جلسہ میں پھنس جاتے ہیں، تو اُن کی شعر گوئی اور شعر خوانی ارباب عقل و بینش کے لئے یقیناً "خودکشی" کا سامان مہیا کر دیتی ہے؛ ایک صاحب کی بیوی کا انتقال ہوا۔ انھیں اپنی رفیقۂ زندگی سے بہت ہی محبت تھی، پھر مرحومہ نے دو تین چھوٹے چھوٹے بچے

بھی چھوڑے تھے جو ہر وقت اِس زخم کو تازہ رکھتے تھے۔ اِن کے احباب میں اکثر اِس جانگداز حادثہ کی اطلاع پاکر تعزیت کر چکے تھے۔ اکثر اِس فرض کو اب ادا کر رہے تھے۔ ایک دیہاتی دوست جو اپنی دہقانیت کو قابلیت کے پردے میں چھپانے کی غرض سے اثنائے تقریر میں بڑے بڑے مشکل، مغلق، اور ناقابل فہم الفاظ استعمال کیا کرتے تھے ریل سے اترے اور اترتے ہی سیدھے پہونچے تعزیت کی رسم ادا کرنے، وہ غریب رونی صورت بنائے بیٹھے تھے اِنھیں دیکھتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے، اِن پر پہلے ہی سے کافی اثر تھا۔ اب اور متاثر ہوئے اور تاثرات کے اظہار کا بہترین طریقہ چونکہ شعر ہے لہذا کچھ کہنے سے پہلے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ اس نازک موقعہ پر کون سا شعر پڑھا جائے جس سے جذباتِ غم کی ترجمانی بھی ہو جائے اور اُن کی تسکین بھی، کچھ دیر سر جھکائے سوچتے رہے پھر ایک طویل اور ٹھنڈا سانس لے کر بولے۔

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر میخواست
آخر آمد زپسِ پردۂ تقدیر پدید

تعزیت کے وقت اشعار پڑھنے کا طریقہ نہایت قدیم ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ سمجھدار اور پڑھے لکھے عمدہ اور مناسب اشعار پڑھتے ہیں، بے وقوف اور "جہلِ مرکب" میں مبتلا حضرات

بے معنی یا بالکل برعکس، شعراء اُردو نے اِس عنوان پر کافی مواد جمع کردیا ہے اگرچہ عہد حاضر کے شاعر اِس نوع کے اشعار نہیں کہتے، تاہم اُردو لٹریچر میں اتنا ذخیرہ موجود ہے کہ ابھی کئی صدیوں تک "مرنے والوں" کی تعزیت کے لئے کفایت کرے گا۔ اور چونکہ جدّت وندرت ملحوظ نہیں رکھی جاتی اِس لئے اِس ذخیرہ کے ختم ہونے کی کوئی صورت ہی نہیں۔ صرف اِسی ایک مصرعہ کو لیجئے۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

تو معلوم ہوگا کہ یہ کتنا پُرانا ہے اور کتنے تعزیت کے خطوط اور تعزیت کی تقریروں میں استعمال ہوچکا ہے مگر اب بھی ہر تعزیت کے جلسہ میں اور ہر تعزیت کے خط میں لکھا جاتا ہے۔

جس گھر میں موت ہوتی ہے اِس میں لازمی طور پر متعدد آدمی ہوتے ہیں۔ جن میں سے کوئی تو مرنے والے کا باپ ہوتا ہے کوئی بھائی، کوئی خالو۔ کوئی ماموں پھر اِن سب کا دائرۂ احباب بھی الگ اور جُدا گانہ ہوتا ہے، اِس لئے تعزیت کا سلسلہ بالکل غیر متناہی ہوجاتا ہے۔ جس کا عنوان بھی نیا ہوتا ہے ور تمہیدی شعر بھی!

اگر کوئی شخص ایسے موقعہ پر قلم دوات لے کر بیٹھ جائے تو آسانی سے ایک مضمون تیار ہوجائے جس میں موت اور

تعزیت کے ذیل میں اتنے اشعار ہوں کہ پوری بیاض بن سکے۔"
اتفاق سے ہمیں ایک موقعہ پر مراسم تعزیت کے مطالعہ کرنے کا بہت اچھا موقعہ ملا۔ صورت یہ ہوئی کہ ہمارے بہت ہی مخلص دوست کا ایک لڑکا مر گیا۔ رسم محبت و خلوص کا تقاضا تھا کہ غم گساری کے طور پر ہم اپنا زیادہ وقت اُن کے یہاں صرف کریں چنانچہ صبح سے شام تک بیٹھے رہے۔ اور کوشش کرتے کہ ایسی گفتگو ہو جس سے اِن کا دِل بہلے، اور یہ زخم جلد بھر جائے مگر جس طرح "بندر گھاؤ" کے متعلق مشہور ہے کہ وہ کبھی مندمل نہیں ہوتا، جہاں ذرا بھرا اور اُس فرنگی قسم کے جانور نے ناخون مار کر پھر ہرا کر لیا۔ اِسی طرح ہندوستان میں رہ کر کسی عزیز کی موت کا زخم اندمال پذیر نہیں ہو سکتا۔ آپ کتنا ہی واقعات غم کو بھلائیں، تفریح اور دلچسپی کی باتیں کریں۔ تسلی اور تشفی کے مرہم رکھیں مگر یہ پوچھنے اور تعزیت کرنے والے احباب نما، دشمن کبھی اِس کوشش میں کامیاب نہ ہونے دیں گے ذرا سکون ہوا اور کسی صاحب نے تشریف لا کر پھر اس ساز غم کو چھیڑ دیا۔

سُنا ہے، تین کا انتقال ہو گیا؟

افسوس کیا لڑکا تھا!

کیسی بھولی صورت پائی تھی!

آپ تو خیر باپ تھے، غیروں کو اِس کا چہرہ دیکھ کر محبت آتی تھی

میری تو آنکھ میں پھرتا رہتا ہے ہر وقت!

کیا پہاڑ ٹوٹ پڑا یہ آپ پر!

آپ ہی کا دِل گُردہ تھا کہ ضبط کر لیا کوئی دوسرا ہوتا تو کپڑے پھاڑ کر دیوانہ وار گھر سے جنگل کی طرف نکل جاتا!

دیکھو شیخ جی ہو گئے ناپاگل بیٹے کے غم میں!

گویا پدر بزرگوار نے بڑی سنگدلی سے کام لیا کہ اس صدمہ جانکاہ،، کو سہ گئے ورنہ حقیقت میں اِنہیں بھی مر جانا چاہیئے تھا۔

سُنا ہے آخر وقت تک مرحوم کو ہوش نہیں آیا!

بس بیہوشی میں ابّا ہی ابّا چیختا تھا!

افسوس ہے شادی کی تمنّا بھی پوری نہ ہوئی!

بھول تو دو دِن بہارِ جانفزا دکھلا گئے

حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

خدا خدا کر کے اِن کی زبان رُکی اور غریب باپ نے زخمِ دِل کو کھرچ کر وہ چپ ہوئے کہ دوسرے بول اُٹھے۔

بھائی جی تو نہیں چاہتا کہ آپ سے صبر کرنے کو کہوں مگر اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔ ابھی ایک سال بھی نہیں ہوا کہ فخرو سدبھار گئے تھے۔ اب میاں تین چل بسے۔!

فلک...... (یہ مصرعہ بھول گیا)

یک داغ بہ نا شدہ داغ دگر نہاد

مگر جناب واقعہ یہ ہے کہ

بھائی کا داغ اور ہے داغ پسر ہے اور
بازو کا درد اور ہے دردِ جگر ہے اور

انھوں نے اپنی دانست میں سب سے اچھے طریقہ پر تعزیت کر کے ذرا ہونٹوں پر زبان پھیری ہی تھی کہ ایک اور صاحب پہلو سے کھو کھلے بانس کی طرح بولے ؎

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا!

حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ صاحبزادہ بالغ ہونے سے قبل ہی مر گیا تھا۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ یہ مصرعہ نہ پڑھا جائے تو مغفرت ہی میں شک باقی رہ جاتا ہے۔

آپ یہ نہ سمجھئے کہ تعزیت، جس کو احباب نے مجلس مشاعرہ بنا دیا تھا ختم ہو گئی اور اشعار کا ذخیرہ بھی نمٹ گیا۔ یہ اُمید تو اِس وقت بالکل نہ رکھئے جب تک چالیس سال کی عمر سے متجاوز حضرات زندہ اور شعراء کے مطبوعہ دیوان موجود ہیں جن میں گُل و بُلبُل اور ہجر و فراق کی داستانیں، موت کی ہچکیوں دمِ واپسین اور نگاہِ بازپسیں، مرگِ ناکام وغیرہ کے متعلق بڑے بڑے کامیاب اشعار پائے جاتے ہیں، برخلاف اِس کے زندہ رہنے، یا مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرنے

اور کشمکش حیات میں پامردی کے ساتھ جمے رہنے کا کہیں ذکر تک نہیں ہے لہذا اب جو بزرگ آئیں گے وہ دور ہی سے دردناک لہجہ میں کہیں گے۔

"کیا کہوں یہ خبر سن کر دل پر کیا گذری، بھائی مجھے تو یقین نہیں آتا کہ بتن مر گئے۔

میری آنکھیں اب بھی اسے دیکھ رہی ہیں،

وہ آئے بھی اور گئے بھی لیکن نظر میں ابتک سمار ہے ہیں وہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں یہ آرہے ہیں وہ جا رہے ہیں ان کے پیچھے ہی ایک صاحب ہانپتے کانپتے، دوڑے ہوئے آئے اور گھٹنوں میں سر ڈال کر بیٹھ گئے پھر آنکھیں نم کر کے بولے۔

آج ہے غم کا مزہ دِل بھر کے رونے دیجئے۔
آستیں کا ذکر کیا دامن بھگونے دیجئے۔

یہ تو زبانی تعزیت تھی جو روز بروز کم ہوتی جارہی ہے اور ڈاک اور تار کی ترقی و ہمہ گیری کا یہی عالم رہا تو مستقبل قریب میں ممکن ہے کہ بالکل مفقود ہو جائے

اب ذرا تحریری تعزیت کا لطف بھی اُٹھا لیجئے ظاہر ہے کہ تار ان دلچسپیوں کا حامل نہیں ہو سکتا جو خط میں آجاتی ہیں، اور منی آرڈر سے بھی اِن لطائف کا بھیجنا ممکن نہیں، لہذا اِن دونوں ذرائع "حمل و نقل" کو گفتگو سے خارج سمجھئے اور ایک خط کا یہ جملہ

ملاحظہ فرمائیے، جو ایک دوست نے اپنے ایک دوست کو اِن کے والدہ بزرگوار کے سانحہ ارتحال پر تعزیت کی غرض سے تحریر فرمایا تھا۔ وہ اِس وفات حسرت آیات پر اشک ملال بہاتے ہوئے آخر میں بڑی ہمدردی اور غم خواری سے لکھتے ہیں۔

خداوند عالم آپ کو صبر جمیل اور مرحوم کا نعم البدل عطا فرمائے آمین،،

اب کوئی پوچھے اُن سے، باپ کے مرنے پر اِس کا نعم البدل اِس کے سوائے اور کیا ہو سکتا ہے کہ اِس کی بد نصیب بیوہ کا عقدِ ثانی تحت لکھنے والے کے" والد ماجد سے کر دیا جائے

اب تک جس تعزیت کا ذکر کیا گیا ہے وہ تو تھی لغوی اور حقیقی تعزیت، اِس کے علاوہ تعزیت کے اور بھی اقسام ہیں جو اصطلاحی یا مجازی تعزیت میں داخل ہو سکتی ہیں،، مثلاً مکان زلزلہ میں گر جانے کی تعزیت، دیوالہ نکل جانے کی تعزیت امتحان میں فیل ہو جانے کی تعزیت تبادلہ کی تعزیت، پنشن کی تعزیت۔

اِن تعزیتوں کے موقعہ پر بھی ادبیت وخطابت کا پورا زور صرف کیا جاتا ہے، اگر وقت ملا تو اِن اقسام کی تفصیلات بھی لکھی جائیں گی، اِس وقت لگے ہاتھوں پنشن کی تعزیت

گا ایک لطیفہ اور سُن لیجئے جو ماضی قریب میں تصنیف ہوا ہے۔

ایک صاحب کی پنشن ہوئی اور اس وقت ہوئی جو قاعدہ سے ان کی موت کے لئے زیادہ موزوں تھا۔ یعنی پورے پچھتر سال کی عمر میں جب وہ چالیس سال تک ملازمت کر چکے تھے۔ یہ خبر مشہور ہوتے ہی تعزیت شروع ہوگئی، افراد بھی آئے اور وفد بھی، دوستوں نے بھی یہ رسم ادا کی اور دشمنوں نے بھی، مردوں نے بھی اور عورتوں نے بھی... کوئی کہتا تھا ابھی سے پنشن دیدی آپ کو۔ ذرا اندھیر تو دیکھئے آپ کی طاقت" آپ کا تدبر اور آپ کی دانشمندی نئے آدمی کو کب نصیب ہو سکتی ہے۔ اور ہماری رائے بھی حقیقت میں یہی تھی کہ پنشن نہ دی جاتی اور انہیں احکام قضا و قدر ہی کے حوالے کر دیا جاتا، مگر اندھیر کا علاج ہی کیا، یہ تو چراغ کے نیچے بھی ہوتا ہے۔

کوئی کہتا تھا ابھی تو آپ دس سال تک اپنے فرائض انجام دے سکتے ہیں۔

کوئی کہتا ہے آدمی جب کام کا ہوتا ہے تو اُسے بے کار کر دیا جاتا ہے۔ یہ بھی عجیب فلسفہ ہے۔

ایک صاحب جوان سے زیادہ بھی خواہ اور خیر اندیش تھے ٹھنڈا سانس لے کر بولے۔

خدا کی قسم ایسا آدمی اب یہاں نہیں آسکتا!

دوسرے صاحب جو ایسے جملوں کی تائید ہی کو وسیلہ معاش جانتے تھے فرمانے لگے!

"اس میں کیا شک ہے"

تیسرے نے کہا، اب کون آرہے ہیں آپ کی جگہ پر!

پہلے صاحب نے خشونت اور بے زاری کے ساتھ جواب دیا "کوئی بھی آئے، جی ہمیں اس سے کیا بحث بہر حال آپ جارہے ہیں، کوئی آئے یا نہ آئے ہمیں کیا۔ بقول شخصے۔ مارا چہ ازیں قصہ کہ گاؤ آمد و خر رفت!

مغالطہ

دُنیا کے اکثر دلچسپ واقعات محض "مغالطہ" کی بنا پر رونما ہوتے ہیں۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ مغالطہ انسانی "مزاج" میں داخل ہے، البتہ یہ ماننا پڑے گا کہ یہ قدرت کا ایک مذاق ضرور ہے، غالباً عقل و دانش کی موجودگی آدمی کی فراخیہ اہلیت کو کم کر دیتی ہے۔ اِسی لئے قدرت کبھی کبھی مغالطہ کی قوت سے انسان کو یہ اہلیت بخشتی ہے۔ مغالطہ حقیقت میں ایک فریب ہے، جس کا تعلق براہ راست عقل سے ہے۔ جب انسانی عقل مغالطہ" کے فریب میں آجاتی ہے تو یہی حضرتِ انسان، جو ہوش و حواس کی درستی میں، ہلکے تبسم

کو بھی اپنے وقار کا حریف سمجھتا ہے، سر سے پیر تک خندۂ بے اختیار بن جاتا ہے۔ مغالطہ کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں ہے، نہ اِس کے لئے کسی مقام اور محل کی قید ہے بس قدرت کی طرف سے حواس پر ایک غبار سا چھایا اور مغالطہ کی بدحواسی سرزد ہوئی۔ مغالطہ کے صدور میں عقل کے کامل و ناقص ہونے کی بھی شرط نہیں، اسی لئے جوانی، بڑھاپا اور تذکیر و تانیث اِس کے دائرہ عمل میں شامل ہیں۔ اکثر ایک آدمی کی حماقت سے دوسرا آدمی مغالطہ میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اِس طرح کسی ظریفانہ واقعہ کا ظہور ہو جاتا ہے۔

ایک دیہاتی بزرگ جو اکثر شہر میں اپنے بھتیجے کے یہاں آیا کرتے تھے اور چچا جان سے موسوم تھے، "مغالطوں" کا مجموعہ تھے، آپ کا معمول تھا کہ جب آتے سیدھے گھر میں جاتے اور گھر کے سب چھوٹے آدمی، عورتوں، بچوں کے سروں پر ہاتھ پھیر پھیر کر دعائیں دیتے پیار کرتے۔

ایک مرتبہ آپ آئے تو حسب عادت براہ راست اُس مکان کا رُخ کیا جس میں پچھلی مرتبہ بھتیجے کی بیوی کو چھوڑ گئے تھے، دروازے پر ذرا ٹھہر کر چچا نے مخصوص انداز سے کھنکار کر اپنی تشریف آوری کا اعلان کیا اور پھر کسی جواب کا انتظار کئے بغیر اندر چلے گئے گھر میں کوئی اور نہ تھا۔ ہو با ورچی خانہ

میں بیٹھی گیلی لکڑیوں کو جھینک رہی تھی۔ چچا بیچ صحن میں کھڑے ہو گئے اور تھوڑی دیر سلام کا انتظار کیا پھر محبت کے ساتھ کہنے لگے۔

"بہو آج کہاں چلے گئے یہ سب کے سب؟

بہو نے خلاف معمول لمبا سا گھونگھٹ کاڑھتے ہوئے منہ پھیر لیا۔

چچا جان کو یہ حرکت سخت ناگوار ہوئی، تاہم باورچی خانے کے پاس آکر فرمایا، بہو آج سلام بھی بالائے طاق ہو گیا!

خیر بھائی خوش رہو!

ارے تم نے منھ سے بولنا بھی چھوڑ دیا!

کچھ تو کہو بھلی مانس!

سلام تو بھول ہی گئیں، کیا بات چیت بھی چھوڑ دی۔

بہو تھیں کہ منہ سے کچھ نہ کہتی تھیں اور مارے شرم کے گھٹنوں میں سر دیئے دے رہی تھیں، چچا کو ترک سلام کی گستاخی کا جواب لینا تھا۔ جب کسی طرح بہو نے ٹس سے مس نہ کی تو آپ بگڑ کر برا بھلا کہتے ہوئے گھر سے نکل آئے اور یہاں سے چھوٹے بھائی کے یہاں گئے، دیکھا تو یہاں سب بیٹھے ہوئے تھے ہر طرف سے چچا جان سلام، چچا جان آداب کی آوازیں آنے لگیں چچا جان بہت مسرور ہوئے اور فرمانے لگے یہ آج چھوٹی بہو

کیوں پھولی بیٹھی ہے۔ میں گھر میں گیا تو سلام تک نہ کیا، پھر دیر تک گھر کا سب کو پوچھتا رہا، مگر اس اللہ کی بندی نے زبان تک نہ ہلائی معلوم نہیں کیا بات ہے؟

کہاں گئے تھے چچا آپ؟

چھوٹی بہو کے یہاں!

اچھا چھوٹی بہو کے یہاں بھی ہو آئے آپ، غضب کر ڈالا آپ نے چچا جان، ارے وہاں تو منشی جی کرایہ پر رہتے ہیں بہو اب وہاں کہاں ہے۔ پچھلے مہینے میں مکان منشی جی کو تین روپیہ مہینہ پر دیدیا گیا ہے کیا اندر چلے گئے تھے آپ؟

چچا نے زور سے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا، توبہ، توبہ! بڑی غلطی ہوئی مجھ سے۔ میں تو اپنا گھر سمجھ کر چلا گیا، مجھے کیا معلوم تھا تم لوگوں نے یہ بے وقوفی کی ہے، لاحول و لاقوۃ!

پھر کیا ہوا اچھا میاں؟

ہوتا کیا، میں سمجھا بہو بیٹھی ہے، شاید منشی جی کی گھر والی ہوگی، دو چار صلواتیں سُنا کر آگیا۔

ایک بار چچا ہمارے ساتھ دہلی جا رہے تھے، اور آپکی چھوٹی بہو بھی ہمراہ تھیں جو زنانہ درجہ میں تشریف فرما تھیں گرمی کا زمانہ تھا، سخت لُو چل رہی تھی، پیاس بڑی شدت سے محسوس ہوتی تھی، اور ہر اسٹیشن پر زنانہ درجہ میں پانی

دینا پڑتا تھا۔ یہ فرض چھوٹا ہونے کے لحاظ سے ہمارے سپرد تھا۔ گاڑی میں بھیڑ بہت تھی ہمارا ڈبہ بھی کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ زنانہ میں بھی کافی ہجوم تھا۔ غازی آباد کا اسٹیشن آیا تو چچا پیاس سے بیتاب ہو کر ٹھنڈا پانی ..... جل ٹھنڈا کی آوازیں سنتے ہی باریک ململ کے کرتہ کی چنی ہوئی آستینوں کو چڑھائے اور پائجامہ اوپر کو سرکاتے قلعی دار لوٹہ ہاتھ میں لے کر اتر پڑے بلکہ صحیح معنوں میں کود پڑے اور لگے پانی والے کے تعاقب میں بھاگنے۔

سقے ... ارے بھائی سقے،

پانی والے!

سقہ جھومتا، مشک ہلاتا، اور کٹورے سے کٹورا کھنکھاتا پھر رہا تھا، آواز سن کر کھڑا ہو گیا۔ چچا نے لوٹہ مشک کے منہ سے لگا کر کہا، جلدی پانی دو، بھائی پانی!

اور دو اتنے میں کیا ہو گا؟

بھر دو جی۔

سقہ نے چچا کے شاندار دیہاتی چہرے پر نظر کی اور زیر لب مسکراتے ہوئے لوٹہ کو منہ تک بھر دیا۔ اتفاق سے برف بھی مل گیا اور چچا نے لگے ہاتھوں ایک آنہ کا برف بھی لیکر لوٹہ میں ڈال لیا، پھر دوڑتے ہوئے ہمارے پاس آئے اور اس انداز

سے گویا حضرت امام حسینؑ کا کوئی فدائی میدان کربلا میں دشمنوں کے نرغہ میں گھس کر پانی بھر لایا۔

لو پانی پی لو! چچا نے اپنے بھیگے ہوئے ہونٹوں کو کرتہ کی سفید آستین پر رگڑتے ہوئے کہا۔

چچا جان مجھے تو پیاس نہیں اس وقت!

دو گھونٹ بغیر پیاس ہی کے پی لو، برف کا پانی ہے۔

ہم نے کہا زنانہ ڈبہ میں پوچھ لیجئے، شاید وہاں ضرورت ہو۔ چنانچہ چچا نے کناروں تک گلاس بھر کر زنانہ درجہ کا رُخ کیا اور قیاس سے برقعہ کا رنگ پہچان کر ایک خاتون کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:۔

بہو پانی پیو گی؟

لو جلدی، گرم ہو جائے گا!

برف کا ہے!

چچا اتنا ہی کہنے پائے تھے کہ دوسرے طرف سے آواز آئی۔ چچا جان اِدھر لائیے میں تو یہاں بیٹھی ہوں۔

ارے تم وہاں کیوں بیٹھی ہو اتنے حبس میں!

اِدھر بیٹھیں ہوا میں۔

چچا پانی پلا کر آئے تو ہم سے بولے بھائی عورتوں کا معاملہ بڑا بیڈھب ہے!

کیوں چچا کیا کوئی لطیفہ ہو گیا۔

چچا ہنسکر بولے کیا بتاؤں؟

دلی پہنچے تو چچا کا ارشاد ہوا، بھتیجے چلو چاندنی چوک کی سیر کر آئیں، ابھی تو دن چھپنے میں دیر ہے۔

چچا میں تو سینما جاؤں گا!

پھر ہمارا تمہارا کیا ساتھ؟...... اچھا چلو کچھ دور تو ساتھ رہے گا۔

ہم دونوں ساتھ ساتھ چلے، چچا استری کئے ہوئے سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے، سر پر نہایت عمدہ بیل دار ٹوپی تھی۔ آبنوسی چہرہ، تیل اور پسینہ کے غازہ سے چمک رہا تھا،... چچا کہنے لگے دیکھو یہ ٹھاٹ ہیں دلّی کے کھوے سے کھوا چھل رہا ہے۔ تمہاری قسم تھالی پھینک دوں تو نیچے نہ گرے۔

یعنی آسمان پر چلی جائے،

نہیں جی، سروں پر ٹھہر جائے چلنے والوں کے۔

چچا دیکھئے کوئی مغالطہ نہ ہو جائے۔

یہاں تو بڑے بڑوں سے ہو جاتا ہے۔ دیکھو سر کرپس سے ہو ہی گیا مجھ سے ہو جائے گا تو کیا تعجب ہے۔

کوئی دوست بھی ہے آپ کا یہاں؟

ہو گا، ضرور کوئی نہ کوئی،

اتنے میں ایک نازک اندام بزرگ گھنٹہ گھر کے نیچے دکھائی دیئے، سفید ململ کی اچکن پہنے، جیب میں رومال ڈالے دوپلی ٹوپی سر پر رکھے، لال رنگ کی شیشام دار لکڑی ٹیکتے اور کچھ گنگناتے چلے جا رہے تھے۔ چچا جلدی سے بولے، لو ایک تو یہ ہیں! اور دوڑ کر ان کی جیب میں رکھے ہوئے رومال پر جو آدھا باہر کو نکلا ہوا تھا ہاتھ مارا وہ دلّی کے رہنے والے قدیم وضع کے بزرگ تھے، مگر غضب کے پھرتیلے واقع ہوئے تھے۔ جلدی سے ایک ہاتھ تو رکھا جیب پر اور باقاعدہ گھوم کر داہنے ہاتھ سے ایک "ضرب" چچا کے رسید کی۔ اب چچا ہیں کہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُنھیں دیکھ رہے ہیں اور مُنہ کھولتے ہیں۔ ہیں کر رہے ہیں۔

معاف کیجئے، مغالطہ ہوا،

تجھے معاف نہیں کیا جا سکتا، یہ کہہ کر اُنھوں نے دوسری ضرب رسید کی، چچا بڑے بیڈھب پھنسے تھے۔ یہ مغالطہ سزا کے ساتھ تھا، اُنھوں نے ہمیں امداد طلب نگاہوں سے دیکھا ہم نے بڑی مشکل سے معاملہ طے کیا اور چچا سے کہا چچا واپس چلئے، ورنہ ایک آدھ مغالطہ ایسا ہی اور ہو گیا تو آپ کو جامع مسجد والے میدان ہی میں سُلانا پڑے گا۔

چچا کے دِل پر اُس واقعہ کا بڑا اثر تھا، ہوتے کہتے تو سچ

ہو مگر کیا کروں۔ دلّی آکر گھر میں بیٹھ رہنا ایسا ہے جیسے مکّہ پہنچ کر بغیر حج کے واپس آجانا،

اگر ایسا ہی ایک حج آپ نے اور کرلیا تو گھر کی جگہ ہسپتال میں رہنا ہوگا دو چار ہفتے۔

اور دو چار دِن مالش تو اب بھی کرنا پڑے گی، انھوں نے کمر کو سہلاتے ہوئے فرمایا...... مگر دیکھو بھتیجے، اِس کا تذکرہ کہیں نہ آنے پائے۔ ضرورت کے وقت تم کہہ سکتے ہو، کہ ٹریم سے گر پڑے تھے،

جھوٹ تو میں نہ بولوں گا، اور اپنی طرف سے تذکرہ بھی کسی سے نہ کروں گا،

بے وقوف،...... اُنھوں نے پھر مقام ضرب پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

اخبار فروش

اخبار فروش بینا ہو یا نابینا، دلچسپی سے کبھی خالی نہیں ہوتا، اس کی رفتار و گفتار، شکل و شباہت، لہجہ اور آواز غرض ہر چیز میں ہلکی ظرافت اور گہری دِل کشی ضرور ہوتی ہے خصوصاً ان صاحبان درد کے لئے جو صرف اندیشہ دُنیا کی بنا پر دِق، میں مبتلا ہو جاتے ہیں، وہ لوگ جو اخبار بینی کے حد سے

زیادہ شایق ہوتے ہیں اور بیسیہ دیگر اخبار پڑھنے کے اصول کی پابندی کرتے ہیں وہ صبح کو اخبار فروش کا بالکل اِس طرح انتظار کرتے ہیں جس طرح جائے نوش حضرات سورج نکلنے کے بعد اپنی محترمہ بیگم صاحبہ کے بیدار ہونے یا دودھ بیچنے والے کے منتظر رہا کرتے ہیں، پھر اخبار فروش بذات خود اتنا جاذب توجہ ہوتا ہے اور اس کی غم آواز میں اتنی کشش ہوتی ہے کہ زبردستی جذب التفات میں کامیاب ہو جاتا ہے اسٹیشنوں پر گاڑی رکتے ہی اور موٹر اسٹینڈ پر موٹر چلنے سے کچھ قبل جب اخبار فروش اپنی مخصوص آواز میں جنگل کے بوڑھے مور کی طرح چیختا ہے۔

اخبار چاہیئے؟

تازہ اخبار!

ہنگامہ خیز خبریں!

موسیولینی پر قاتلانہ حملہ!

گوئرنگ کی نظر بندی!

ہیس کی حیرت انگیز گرفتاری!

روس کے مورچہ کی عجیب وغریب اطلاعات!

بحرالکاہل میں تلاطم!

تو مسافر چاہے کتنی ہی گہری فکر میں مبتلا ہو اور چاہے وہ اپنے کسی عزیز کی موت کے تار پر ہی گھر جا رہا ہو مگر ناممکن ہے

کہ وہ اخبار فروش کی طرف متوجہ نہ ہو جائے اور شوق و دلچسپی کی نگاہوں سے نہ دیکھنے لگے، یہ دوسری بات ہے کہ اخبار خریدنے کی ہمت نہ ہو اور اقتصادی حالت عام اخبار بینوں کی طرح خراب ہو مگر ایک مرتبہ وہ اخبار فروش کی زبانی خبروں ہی کو سننے کے لئے ادھر دیکھنے لگتا ہے جو بجلی سے چلنے والے ریڈیو کی طرح بغیر کسی قانونی ذمہ داری کا لحاظ کئے ایک ہی سانس میں سخت سے سخت خبریں بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ بعض سادہ لوح تو گھر پہنچکر اپنے احباب سے وہ خبریں نقل بھی کر دیتے ہیں چنانچہ مجلس احباب میں جب سوال ہوتا ہے کہئے کوئی تازہ اخبار بھی دیکھا آپ نے؟ کچھ لڑائی کے متعلق بھی معلوم ہے۔؟

تو اخبار فروش کا یہ شاگرد رشید فوراً بول اُٹھتا ہے جی ہاں کیوں نہیں اخبار بینی کے بغیر تو میرا کھانا ہی ہضم نہیں ہوتا دس بارہ روزانہ اخبار آتے ہیں میرے پاس، اس کے بعد وہ خبریں بیان کرنا شروع کرتا ہے اور اخبار فروش کو بھی اس سلسلہ میں پیچھے چھوڑ جاتا ہے چونکہ ہندوستان میں باہر سے آئے ہوئے آدمی کو تازہ حالات کی روایت کے سلسلہ میں بالکل سند یافتہ خیال کیا جاتا ہے اور ہر ایسے تازہ وارد سے جو سچ کی نسبت جھوٹ کو ہر دلعزیزی کا مضبوط ذریعہ خیال کرتا

ہے جنگ کی تازہ اطلاعات کا پوچھنا اعزہ کی خیریت پر مقدم رکھا جاتا ہے اِسلئے ایسی۔ ایسی مفتوات اِن جاہلوں کے ذریعہ سے پھیل جاتی ہیں کہ انہیں نہایت آسانی سے جیل تک پہنچا دیا جا سکتا ہی۔

عام دستور کے مطابق توجن باخبر ارباب نظر نے عمر میں کبھی اخبار نہ دیکھا ہو وہ بھی ریل میں بیٹھکر اخبار خریدنا ضروری خیال کرتے ہیں بعض فضول خرچ تو محض اِس بنا پر کہ اپنے ساتھیوں میں وہ بڑے آدمی ثابت ہو جائیں دو دو اور چار چار اخبار لے کر بستر پر ڈال لیتے ہیں، سب سے زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ بے پڑھے اہل الرائے بھی محض اظہار خیال کی نیت سے اخبار لے کر کسی پڑھے لکھے آدمی کو دیکر فرماتے ہیں۔ ذرا پڑھئے تو سہی مہربانی کر کے، کیا کہوں میری عینک، رہ گئی گھر پر! اور جو صاحبان چشمہ کسی حسن اتفاق کی بنا پر ڈیوڑھے یا دوسرے درجہ میں سفر کرنے کا زریں موقعہ حاصل کر لیتے ہیں وہ اُردو کے اخبارات پڑھنا داخل توہین خیال کر کے انگریزی اخبار خرید کر یا تو الٹی طرف سے ہاتھ میں لے کر بیٹھ جاتے ہیں یا محض اِس اُمید پر تکیہ کے نیچے رکھ لیتے ہیں کہ گھر پہنچ کر ڈکشنری کی امداد سے پڑھ لیں گے۔ بہر حال اخبار فروش کے اعجاز کلام کا اتنا اثر ضرور ہوتا ہے کہ گارڈ اور ڈرائیور کے۔ علاوہ اکثر مسافر اخبار کیلئے کچھ نہ کچھ قربانی کر ہی ڈالتے ہیں۔ کبھی اخبار فروش اپنے ہندوستانی اصرار سے اخبار لینے پر مجبور کر دیتا ہے اسکی صورت بالعموم یہ ہوتی ہے

کہ کوئی نوجوان نامہ نگار یا مضمون نگار اپنی بھیجی ہوئی خبر یا مضمون دیکھنے کی غرض سے اخبارات الٹ پلٹ کرنے لگتا ہے یا ویسے ہی خاص خاص تازہ اطلاعات سرسری بلکہ دزدیدہ نظر سے دیکھنے لگتا ہے اور پھر قیمت پوچھ کر بددلی اور نفرت سے اخبار واپس کر کے کہتا ہے بہت گھٹیا اخبار ہے۔ سب پرانی خبریں ہیں، زبردستی صفحات سیاہ کر دیتے ہیں، لیکن، اخبار فروش سر ہی ہو جاتا ہے نہیں بابو جی سب تازہ خبریں ہیں کوئی باسی خبر نہیں اور کیا باسی کھانا پھینک دیتے ہیں آپ۔

اب تو اخبار آپ کو لینا ہی پڑیگا۔

خیر اخبار نہ لیجئے پیسہ تو اصولاً آپ کو دینے ہی چاہئیں اخبار تو دیکھ چکے آپ!

اگر اِن باتوں کا خریدار کے دِل پر کوئی اثر نہیں ہوتا تو اخبار فروش ذرا بے تکلفانہ اور طنزیہ لب و لہجہ اختیار کرتا ہے۔

بابو جی سفر بغیر اخبار کے کٹنا مشکل ہے اخبار لینے کا ارادہ نہ تھا تو بیوی کو ساتھ لے کر چلنا چاہیئے تھا آپ کو!

صورت سے تو پڑھے لکھے معلوم ہو رہے ہیں آپ؟

بابو جی ٹکٹ چاہے آپ نے نہ لیا ہو لیکن میری بات مانئے اخبار ضرور لے لیجئے!

اب چاہے یہ سفید پوش مسافر واقعی بغیر ٹکٹ ہی ریل میں

سفر کر رہا ہو اور اس کے جیب میں ایک وقت کی چائے کی قیمت سے زیادہ دام نہ ہوں مگر وہ اخبار لے ہی لیتا ہے، اور اخبار فروش اپنی فاتحانہ مسرت کو ہلکے سے تبسم میں ظاہر کر دیتا ہے۔

بڑا اسٹینڈ پر جب اگلی سیٹ پر کسی بھاری بھر کم آدمی کو اخبار فروش دیکھ لیتا ہے تو پھر گدائے معصوم کی طرح وہ وہیں سائلانہ صدائیں لگانا شروع کر دیتا ہے۔

حکومت جاپان نے قدم بڑھایا تو مقابلہ کیا جائے گا؟

روسی مورچہ پر گھمسان کی لڑائی!

زوردار خبریں!

جب اخبار فروش کا یہ کلام منثور خریدار کے دل پر مؤثر نہیں ہوتا تو وہ فوراً پہلو بدل کر حضرت حفیظ جالندھری کے انداز میں نظم گانا شروع کر دیتا ہے،

معاملہ ڈٹ گیا ہے!

دشمن پیچھے ہٹ گیا ہے!

پورا رجمنٹ کٹ گیا ہے!

کالا بادل چھٹ گیا ہے!

اگر اخبار فروش خوش قسمتی سے نابینا ہے تو پھر اسی بلند نظم کے ساتھ اس کی نیرت حد سے زیادہ دلچسپ ہوتی ہے گلے کی رگوں کا پھولنا، آواز کے ساتھ دانتوں اور پوری فضائے حلق کا کھلنا آنکھوں

کا اِدھر اُدھر متحرک ہونا، بہت ہی عجیب منظر پیش کرتا ہے جس کا لازمی اثر یہ ہوتا ہے کہ مسافر خواہ کتنا ہی جنگ اور واقعات جنگ سے بے تعلق ہو مگر اخبار کا ایک پرچہ لینے پر ضرور مائل ہو جاتا ہے!
ایک مرتبہ ہمارے ایک تماشائی دوست جو ہمارے ساتھ بلکہ ہمارے کرایہ پر موٹر میں سفر کر رہے تھے اور ہم نے گرمی کے خیال سے انھیں انجن کی ہم آغوشی سے لطف اندوز ہونے کی غرض سے آگے بٹھا دیا تھا اپنی جگہ بیٹھے سگرٹ پی رہے تھے اتنے میں اخبار فروش آگیا اور اس نے ان کی سگرٹ نوشی سے یہ غلط اندازہ لگا لیا کہ صاحب اخبار دیکھنے کا بھی ضرور شائق ہوگا حالانکہ بدقسمتی سے صاحب اُردو بھی بہت واجبی ہی جانتے تھے اخبار فروش صاحب کی عینک کو مخاطب کر کے رجزیہ انداز میں بولا

باندھو اپنے گوئیلز کو۔ پرانے تھیلے میں،

اور ہیل، ہیل، ہیل،

اور گوئرنگ ہے کس کام کا، دھیلے کا نہ دام کا۔

ہیل، ہیل، ہیل۔

صاحب کے مُنہ پر سُرخی دوڑ گئی اور انھوں نے دھواں چھوڑتے کے دوران میں ہونٹوں سے دی V کا ایک نشان بناتے ہوئے ہماری طرف مڑ کر دیکھا قیافہ نے فوراً مخبری کی صاحب اخبار لینا چاہتا ہے ہم نے کہا بھائی آپ بھی عجیب آفت جان ہیں صبح

سے اب تک آٹھ آنے کی چائے پی گئے۔ ایک ڈبیہ سگرٹ کی خالی کر دی، پانوں کا ڈبہ بھی صاف ہو گیا اب معلوم ہوتا ہی اخبار خریدنے کی دھن سوار ہے آپ پر اس سے تو یہ بہتر تھا کہ آپ بچوں کے لئے دو پیسہ کے بسکٹ ہی لے چلتے۔

نہیں جی اس وقت اخبار لینا بہت ضروری ہے جلد دو پیسے نہیں تو میری توہین ہو جائے گی اور تم جانتے ہو میں عزت کے پیچھے جان دینے کو بھی ہر وقت تیار رہتا ہوں لیکن عزت کے لئے آپ کو کسی کی جان لینے کا حق بالکل نہیں،

ہے کیوں نہیں دیکھتے نہیں ہو مزدور ہر وقت سرمایہ دار کے خون کا پیاسا رہتا ہے اگر اسے ذرا موقعہ مل جائے تو وہ سرمایہ داروں کو زندہ نہ چھوڑیں میرے اور تمہارے درمیان بھی مزدور اور سرمایہ دار کی نسبت ہے، تمہیں ہر وقت کافی ہوشیار رہنا چاہئے اور اس حقیقت کو کبھی نہ بھولنا چاہئے کہ۔

مزدور خوش دِل کند کار بیش

لیکن میں نے آپ سے مزدور کا کام اب تک نہیں لیا آپ کی یہ حیثیت پہلے سے ظاہر ہو جاتی تو سامان اُٹھانے کی اجرت دو آنہ میں کیوں دیتا۔

اخبار فروش اتنا سہارا پا کر ان کے سر ہو گیا ہا بابو جی آج تو اخبار پڑھنے کے لائق ہے!

کوئی تازہ خبر بھی ہے آج؟

جی ہاں دیکھئے، کچھ صفحے بھرے پڑے ہیں تازہ خبروں سے! ذہین اخبار فروش ناموں سے بہت فائدہ اُٹھاتے ہیں اگر معمولی آدمی موٹر یا ریل کے کسی حادثہ میں کام آجاتا ہے تو اخبار فروش سوچتا ہے اِس نام کا کوئی مشہور آدمی بھی ہے ہندوستان میں یہ ناممکن ہے کہ ایک نام کے دو آدمی نہ مل جائیں، جب کہ ایک تخلص کے دس شاعر ہندوستان میں بآسانی دستیاب ہو جاتے ہیں، اخبار فروش اپنے اِس مقصد میں کامیاب ہوتے ہی چیخنا شروع کر دیتا ہے فلاں مولانا یا سر یا قائد حریت، حضرت شاہ..... صاحب موٹر کے حادثہ میں مجروح ہو گئے اور ہسپتال پہنچکر بالکل مر گئے!

اِس قسم کے مواقع اخبار فروش کے لئے نہایت مبارک ہوتے ہیں اور اِن کے بہت سے پرچے فروخت ہو جاتے ہیں۔ آخر غائبانہ نماز جنازہ ادا کر دینے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ مرنے والا صرف آدمی تھا، کوئی حضرت یا مولانا یا شاہ وغیرہ نہ تھا اخبار فروش کی خوش نصیبی سے کوئی ریل گاڑی پٹری سے اُتر جائے یا ایک گاڑی دوسری گاڑی سے ٹکرا جاتی ہے تو اِس کی گل افشانی حد سے گذر جاتی ہے،

کلکتہ میں قیامت آگئی!

ہزاروں مسافر مر گئے!
ریلوے لائن بند ہو گئی!
غم کا دریا اُمنڈ آیا!
زخمیوں کی چیخ پکار سے کانوں کے پردے پھٹ گئے!
بچوں کے رونے سے آسمان گونج اُٹھا،
حضرت امیر الملت، کی دریا دلی۔
مظلوموں کی شاہانہ امداد،

اخبار فروش کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اخبار کے مالکوں کا ہمیشہ دشمن ہوتا ہے اور ایک مہینہ یا چند مہینے مسلسل کوئی اخبار منگانے کے بعد اس کی ساری قیمت خود ہی صرف کر لیتا ہے، اور مینیجر کے سخت سے سخت تقاضے بھی اُسے رقم ادا کر دینے پر مجبور نہیں کر سکتے، یہی وجہ ہے کہ اخبار فروش کے پاس ہمیشہ نئے اخبار کی ایجنسی ہوتی ہے۔

ــــــ ث.....ث ــــــ

عید خولیا

مالی خولیا کی طرح "عید خولیا" بھی ایک بیمار ہے جو اکثر نازک مزاج بیگمات اور مصروف قسم کے درزیوں کو ہوا

کرتی ہے، بیگمات تو شب برات کے بعد ہی اِس میں مبتلا ہو جاتی ہیں، چنانچہ پہلے رمضان کا انتظار کیا جاتا ہے اور رمضان سے عید کا خیر مقدم کیا جاتا ہے اور بیگم کی بالکل وہی کیفیت ہو جاتی ہے جو کلکٹر یا کمشنر کے دورے کی خبر سن کر کسی میونسپلٹی کے چیرمین کی ہو جایا کرتی ہے، وہی بدحواسی، وہی ہول دلی اور شوہر غریب پر وہی غصّہ جو بلدیہ کے جمعداروں یا چپراسیوں پر جناب چیرمین بہادر کو آیا کرتا ہے، غرض ایک تو عید خولیا کا اثر دوسرے روزے کی چڑچڑاہٹ دونوں چیزیں مل کر شوہر بدنصیب کے لئے شامتِ اعمال کی صورت اختیار کر لیتی ہیں اور یہ اپنے گھر کے چھوٹے سے "بلدیہ" کا چپراسی صبح سے شام تک بازار کے چکر لگاتا رہتا ہے ایک بزرگ کا مقولہ ہے کہ عید خولیا سے اختناق الرحم ہی اچھا ہے کہ عورت بے ہوش ہو کر پڑی رہتی ہے اور نیاز مند کو روٹی اور دعائے صحت کے علاوہ کسی چیز کی فکر نہیں رہتی، لیکن اِس عید خولیا سے تو ناک میں دم آ جاتا ہے۔ صبح کو اُٹھتے ہی اور رات کو پلنگ پر لیٹتے ہی گھر میں عید کا ذکرِ خیر شروع ہو جاتا ہے۔ اور جب تک نیند نہیں آتی یا باہر سے کوئی "مردِ غیب" زنجیر نہیں ہلاتا اِس کا سلسلہ جاری ہی رہتا ہے۔

"منے" کا جوتہ بالکل ٹوٹ گیا۔

اور نہ ٹوٹتا تو بھی نیا لینا ہی پڑتا۔

اِدھر عید سر پر آگئی۔

میں چاہتی ہوں کہ ببّے کی شیروانی محلہ کے سارے بچّوں سے اچھی رہے، کپڑا خوبصورت بھی ہو اور چمکدار بھی۔

آج رمضان کی دوسری ہے۔ کپڑا آجاتا تو میں سینا شروع کر دیتی آخر ایک دم سے کیا کیا کروں گی میرے تو ہاتھ پیر پھول جاتے ہیں، اکیلی جان اور ہزاروں بکھیڑے!

کیا سو گئے آپ؟

جی نہیں، آپ کی موجودگی میں سونا اور ہٹلر کی زندگی میں امن بھلا یہ کیوں کر ممکن ہے؟

کیوں میں کیا کرتی ہوں۔

باتیں!

اچھا اب میری باتیں بھی ناگوار ہونے لگیں۔

جی ہاں آخر کان بھی تو کمزور ہو گئے اب!

کچھ بھی ہو یہ باتیں تو سننا پڑیں گی۔

بالکل، نہایت ادب سے سنوں گا، میں نے کب انکار کیا۔

انکار نہیں کیا تو جواب بھی نہیں دیا۔

جواب کی ضرورت ہی کیا تھی آپ جو کچھ فرما رہی ہیں وہ کرنا ہی پڑے گا مگر یہ ابھی سے عید کے اہتمام کی کیا ضرورت ہے

میری رائے میں سب سے پہلے شیر خرما پکنا چاہیئے!
کیوں ضرورت کیوں نہیں آخر رہ کے دِن گئے عید کے؟
ابھی تو پورا ایک مہینہ باقی ہے!
پلک مارتے بیت جائے گا یہ ایک مہینہ آپ کا اور صاحب اہتمام کیوں نہ ہو کرنا تو مجھے پڑتا ہے سب کچھ ایک دو کپڑے تو ہیں نہیں خدا کے فضل سے پانچ بچوں کے پورے پورے جوڑے ہوں گے اور دو چار بڑے کپڑے بھی ہوں گے۔
یہ کوئی اہم بات نہیں ایک درزی پوری سفر مینا کے کپڑے سی کر ڈال دیتا ہے آپ پانچ بچوں کی فکر میں سوکھی جارہی ہیں اور کچھ درزی بھی تو کرے گا۔
درزی کیا کرے گا زیادہ سے زیادہ شیروانی سی دے گا آپ کی بس۔ اسی لئے بے فکر ہیں آپ؟
اچھا تو آپ چاہتی کیا ہیں؟
میں کپڑا چاہتی ہوں ضرورت کے بالکل مطابق اور روپیہ چاہتی ہوں ضرورت سے تھوڑا بہت زیادہ۔
اس ضرورت پر میں بھی صاد کرتا ہوں!
پھر جائیے بانہ اد ابھی!
اس میں شک نہیں کہ کپڑا لانا اور روپیہ مہیا کرنا ہمارے ہی فرائض میں داخل تھا۔ چنانچہ ان کا مطالبہ پورا کیا گیا اور

بہت سا کپڑا تانگے میں لاد کر ہم گھر پہنچے۔ دشواری یہ تھی کہ وہ ذرا مشکل پسند واقع ہوئی تھیں۔ اُنھوں نے نصف سے زیادہ کپڑا تو پسند فرما دیا اور جو پسند آیا اُس کے نرخوں میں اتنے اعتراضات کیئے کہ وہ بھی اِسی ذیل میں آگیا نہ بزاز آٹھ آنہ گز کی کمی کرے گا نہ ہمارا اس کا معاملہ پٹے گا۔ بالآخر دوسرا چکر پھر کیا گیا۔ اس مرتبہ بچوں کی شیروانیوں کے چند کپڑے بطورِ خاص ہم لیتے آئے تھے، اُنھوں نے دیکھکر پوچھا،

یہ کیا ہے؟

بچّوں کی شیروانیوں کا کپڑا ہے، پسند ہے آپ کو؟

جی نہیں، یہ بچّوں کی شیروانیوں کا نہیں ہے۔ بوڑھوں کے انگرکھوں کا ہے، نہ چمک نہ دمک نہ پھول نہ پتی، یہ کیسا کپڑا، میرے بچے مولوی یا صوفی نہیں ہیں،

آخر بتایئے نا کون ہیں تاکہ بزاز سے کہدوں ویسا ہی کپڑا دیدے شاعر ہوں تو ویسا لاؤں قوال ہوں تو ویسا اور ایکٹر ہوں تو ویسا، ذرا صاف بتا دیجئے۔

سمجھ لیجئے وہ سب کچھ ہیں۔

بہت اچھا، اب لے آؤنگا اور مجھ سے اتنی محنت لینا تھی تو روزہ کیوں رکھوایا تھا۔ اب تو پہلے میں کھانا کھاؤں گا پھر بازار جاؤنگا۔

یعنی کیا روزہ توڑ رہے ہیں آپ؟

بالکل!

یہ کیوں؟

دن بھر بھاگتے بھاگتے پیٹ جو خالی ہو گیا اور پیاس کے مارے جان جو لبوں پر آ گئی، پھر مسافر کے لئے یہ حرکت جائز بھی تو ہے اگر بازار تک کا فاصلہ ناپ کر میرے چکروں کے عدد سے اُس کو ضرب دی جائے تو کئی شرعی منزلیں بن جائیں گی۔

مسئلے مسائل تو میں نہیں جانتی مجھے تو آپ کی باتوں پر ہنسی آتی ہے، خیر آپ کو اختیار ہے کھانا لاؤں؟

ضرور!

خدا خدا کر کے کپڑے کی خریداری ختم ہوئی اور عید اب اتنی قریب آ گئی ہے کہ عید کی خالص بیگماتی ضروریات کا تصور کیا جانے لگا، اُنھوں نے ایک دن ہمارے لیٹتے ہی پوچھا عید کب ہے؟ ہم سمجھ گئے یہ سلسلۂ دراز سحری سے پہلے ختم نہ ہو گا اِس خطرے کے پیشِ نظر انھیں چپ رہنے کا اشارہ کر کے خوب زور سے چیخ کر کہا کون صاحب ہیں؟

زبردستی!...... وہ بولیں۔

نہیں کوئی بُلا رہا ہے، ذرا دیکھ آؤں!

مگر اِن لطیف حیلوں سے کب کام چلتا تھا، واپسی پر پھر وہی

سوال ہوا، بتلایئے نا عید کب کی ہے۔
جب روزے ختم ہو جائیں۔
میرا مطلب یہ ہے کہ چاند کس تاریخ کو ہوگا؟
انتیس کو ورنہ تیس کو، قمری مہینوں میں اکتیس اور اٹھائیس کا تو کوئی جھگڑا ہی نہیں؟۔ یا اللہ یہی تو پوچھتی ہوں کہ تیس کو ہوگا یا انتیس کو؟"
میں بھی تو یہی عرض کر رہا ہوں کہ انتیس کو ہوگا ورنہ پھر تیس کو،
آپ تو مجھے بے وقوف بناتے ہیں میں پوچھتی ہوں جنتری والے کب کی بتاتے ہیں چاند رات؟
توبہ کیجئے ہم نے عرض کیا بھلا ہیں اور آپ کو بے وقوف بناؤں خداوند عالم نے اپنی کاری گری میں میرے لئے ایک نقطہ کی بھی گنجائش باقی نہیں چھوڑی۔ رہا جنتری والوں کا چاند کے متعلق کچھ کہنا یا نہ کہنا تو میں جو کچھ کہتا ہوں وہی جنتری والے بھی کہتے تھے، آپ بالکل یقین کریں کہ انتیس یا تیس کو چاند ضرور ہوگا۔
اب فرمائیے کیا ارشاد ہوتا ہے؟
ارشاد کیا ہوتا ہے۔ عید کا سامان آجانا چاہئے چار چھ دن پہلے بہت مناسب ہے، لیکن میری رائے میں دودھ سب سے

پہلے آنا چاہیئے وہ بہت دور سے آئے گا!

آپ نے تو پھر مذاق شروع کر دیا۔

اچھّا تو فرمائیے اور کیا کیا آئے گا؟

لکھئے۔ سویاں ۵ سیر، چاول عمدہ ۱۰ سیر قند ۱۲ سیر، گھی چھ روپے کا دو، کشمش ایک سیر، پستہ آدھ سیر، خرما ۲ سیر"

ذرا ٹھیریئے ورق ختم ہو گیا۔

ابھی سے ... اچھّا اور لکھئے ورق نقرہ ایک گڈی، عرق کیوڑہ ایک بوتل، زعفران ایک تولہ،

اچھا پہلے یہ تو بتا دیجئے کہ آپ اپنے خاندان کی کتنی مویشیوں کو ایک وقت دعوت دینا چاہتی ہیں،

بس ابّا ہوں گے اور شاید اماں بھی آجائیں دو چار آدمی عزیزوں میں سے اور آجائیں گے اور یہ مویشی کس کو کہا آپ نے؟

کسی کو نہیں جلدی میں مُنہ سے نکل گیا معاف فرمایئے!

یہ وقت مذاق کا نہیں ہے!

بہت اچھّا،

اب آئی چاند رات اور ان پر "عید خولیا" کا پوری شدت سے دورہ پڑا ہم جو گھر میں آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک تخت پر تمام نئے کپڑے جو درزی کے یہاں سے آئے تھے اور گھر تیار ہوئے تھے نہایت بے ترتیبی سے پھیلے پڑے ہیں دوسری طرف باورچی خانہ کے

سامنے گھر سے تمام برتن، رکابیاں، پیالیاں، اور معلوم نہیں کیا کیا چیزیں نکلی رکھی ہیں اور وہ پکار پکار کر کہہ رہی ہیں ماما دیکھو برتن گن لو کتنے ہیں۔

صاف ہو جائیں اچھی طرح!

اور چمچے تو رہ ہی گئے!

ارے وہ بڑا دیگچہ کہاں ہے؟

اور کفگیر دیکھ لینا دو بڑے اور دو چھوٹے نکال لئے یا نہیں!

بڑی بی تم کیا کر رہی ہو؟

کپڑوں کو دیکھ لو اچھی طرح!

دیکھو کسی قمیص میں کاج تو نہیں رہ گئے!

بٹن تو سب ٹانک دیئے ہیں نہ تم نے!

ہاں ذرا کمر بند بھی دیکھ لینا!

موزے اور جوتے بھی نکال لو،

اچھا اب جلدی جلدی بچوں کے منہ ہاتھ دھو ڈالو۔

یہ تو ہوا بیگمات کا عید خولیا جو ہماری رائے میں ہر شریف گھر کی ہر شریف عورت کو جسے اصطلاح میں بیگم، بیوی، گھر والی، اہل خانہ، اُن یا صرف "اندر"، وغیرہ ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے، ہوتا ہے۔ اب رہا درزیوں کا عید خولیا جس میں اِن کی فکر معاش کو بھی کافی دخل ہے وہ کبھی نہایت سخت اور تکلیف دہ ہو جاتا

ہے ہر درزی جو ذرا بھی سینے پرونے کے فن لطیف سے واقف ہے رمضان آتے ہی گویا ہٹلر اور مسولینی بنجاتا ہے نرمی، انسانیت اور تہذیب سے بات کرنا ہی بھول جاتا ہے اور کوئی کپڑا بغل میں داب کر اس کی دوکان پر جایئے تو وہ نہایت خشکی سے سوال کرتا ہے کیا ہے؟

کپڑا ہے ایک شیروانی کا!

فرصت نہیں مجھے اور کہیں جایئے! حالانکہ دو مہینے پہلے ہی درزی پکار پکار کر کہا کرتا تھا، آیئے حضرت، تشریف رکھئے میرے لائق کوئی خدمت ہو تو فرمایئے اور یہ بغل میں کیا ہے شیروانی بنے گی کیا؟ اس تنگدستی کے وقت تو یہ کم بخت کفن کو بھی شلواروں کا کپڑا سمجھ لیا کرتا تھا اور اب یہ حالت ہے، مولانا روم نے غالباً اسی موقعہ کے لئے کہا ہے۔

این فسادِ خوردنِ گندم بود

غرض یہ استاد، اور ماسٹر عید کا موسم آتے ہی ایسا ناتراشیدہ انسان بن جاتا ہے جس سے مروت، انسانیت اور اخلاق کو کوئی نسبت ہی نہیں رہ جاتی گذشتہ عید کو ہم نے بڑی تلاش و جستجو کے بعد اچھی شیروانی کیلئے ایک نہایت عمدہ کپڑا خرید کیا عید قریب آگئی تھی، اور شہر بھر میں تین چار درزی ہی ایسے تھے جو ہمارے عقیدے میں شیروانی سینے کی اہلیت رکھتے تھے ان میں سے دو نے تو صاف جواب دے دیا۔ ایک نے کہا بہت اچھا کب چاہیئے؟

"عید پر" ہم نے جواب دیا۔

عید پر تو نہیں دے سکتا عید کے دو روز بعد تو دے سکتا ہوں درزی کی اِس بیہودگی پر جی تو چاہا کہ اِس کے ہاتھ سے لمبی سی قینچی لے کر کم سے کم کہیں چبھو ہی دوں مگر اتنی سی غیر ادبی حرکت بھی ہماری طبع غیور کو گوارا نہ ہوئی، جو بھلے درزی کی خدمت میں پہونچے تو انھوں نے ہماری وجاہت سے مرعوب ہو کر کپڑا لے لیا اور جلدی جلدی پیمائش کر کے کتاب میں دو چار انٹ سیدھے ہندسے لکھ لئے اور ہم سے کہا عید کی صبح کو منگا لیجئے گا۔

عید کی صبح آپ جانتے ہیں دو بجے رات ہی سے ہو جاتی ہے اور جن گھروں میں بچے ہوتے ہیں وہاں تو یوں سمجھئے سورج عید کی رات کو غروب ہی نہیں ہوتا۔ مگر ہم نے واقعی صبح کا انتظار کیا اور جب ذرا سورج بلند ہوا تو درزی کی دوکان پر پہونچے، استاد غسل کے لئے تشریف لے جا چکے تھے، اور اپنے شاگردان کو ہدایت فرما گئے تھے کہ جو صاحب آئیں اُن کے کپڑے جن پر اِن کے ناموں کی چٹیں لگی ہوئی ہیں دے دیئے جائیں۔ ایک صاحب نے ہمارا نام پوچھا اور کپڑے کی قسم معلوم کی ہم نے بقول اُن کے اپنا اِسم شریف بتایا اور عرض کیا شیروانی ہے سرج کی، ہلکے نیلے رنگ کی وہ تمام شیروانیوں کی چٹیں پڑھ کر آیا اور کہنے لگا آپکے نام کی چٹ کسی شیروانی پر نہیں ہے ہمیں سخت حیرت ہوئی

اور طرح طرح کے شبہات دِل میں پیدا ہونے لگے، خیال ہوا کہ شاید دھوکہ دیا، اور شیروانی تیار نہیں کی، اتنے میں ایک سوکھا سا مدقوق قسم کا درزی جو بڑی مصروفیت اور پوری قوت کے ساتھ لوہا کرنے میں مصروف تھا بولا کیا ہے؟

آپ کی شیروانی نہیں ملتی!

کیا نام ہے آپ کا؟

شاہد جونپوری!

بھائی یہ مصرع تو میں نے کسی کوٹ پر لکھا دیکھا ہے اِس نے کہا اور اُٹھ کر ایک کوٹ معہ ویسکوٹ کے اُٹھا لایا، دیکھتے ہی ہمارے جسم میں سر سے پیر تک آگ لگ گئی،

کوٹ نہیں سلوایا تھا جی ہم نے!

یہ تو استاد ہی کو معلوم ہوگا آپ نے کیا سلوایا تھا۔

کہاں ہے وہ، میں اِسے کیا کروں گا۔

واقعہ یہ تھا کہ آج تک ہم نے کوٹ پہنا ہی نہ تھا کبھی اور پھر کوٹ بھی کیسا قمیص سے دو تین بالشت اونچا پتلون پر پہننے

ابے میں کیا کروں گا اسے؟

پہنیئے گا حضور!

میں نہیں پہن سکتا اِس کو!

پھر دودھ میں پکا کر کھائیے گا!

کیا بکتا ہے بے!

اِس نے ہنسکر مُنہ پھیر لیا، ہم دیر تک دوکان پر کھڑے رہے اُستاد غائب تھے اِن کا کہیں پتہ نہ تھا معلوم ہوا کہ عید کے دن اُستاد ہمیشہ یوہنی غایب ہو جایا کرتے ہیں مبادا کوئی فروگذاشت ہو جائے یا کوئی کپڑا تیار نہ ہو سکے اور رمضان کے "زاہدان مرتاض" خفا ہو کر جہاد شروع کر دیں عید کے دو چار دن کے بعد معذرت کر کے وہ مشتعل لوگوں کو ٹھنڈا کر دیا کرتے تھے، چنانچہ دو دِن تک استاد ہمارے ہاتھ ہی نہ آئے تیسرے دِن ہم پہونچے تو وہ دور ہی سے دیکھ کر کھڑے ہو گئے اور فرمانے لگے سرکار میں بہت شرمندہ ہوں آپ سے شیروانی کی جگہ کوٹ کی پیمائش لے لی، اور کپڑا بچا تو سوچا کہ اِس میں ویسکوٹ ہو جائے گی، خدا کی قسم اِسی کپڑے کی شیروانی آج ہی تیار کر کے پہنا دوں گا، حضور کو اب تو جو کچھ ہُوا اُسے معاف فرمائیے۔

کاتب

اگر ایسی چیزوں کی تلاش کی جائے جو یکسر مفید بھی ہوں اور مضر بھی۔ مگر نہ ان کی مضرت کا وقت متعین ہو نہ منفعت کا تو دو ہی چیزیں ہاتھ آئیں گی۔ کاتب اور نائی...!

نائی کی منفعت سے کیسے انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن ہوشیار رہیے

ہوشیار اور مہذب سے مہذب حجام کی نسبت بھی نہیں کہا جا سکتا کس وقت وہ اُنگلی کا جیتا ہوا تا خون کاٹ کر آدمی کو بےچین کر دے اور کب بال کاٹتے وقت اس کا ہاتھ بہک جائے اور مشین مُنہ بھر کر بال اُکھاڑے۔ یا کسی لمحہ اُس کا تیز ولایتی اُسترا آغا خانی گھوڑے کی طرح شوخی پر آمادہ ہو جائے اور صفحۂ رخسار پر دوڑتے دوڑتے کوئی ایسا زخم لگا دے جسے چشم زخم بھی نہ کہہ سکیں اور نائی کو اس جرم میں سزا بھی نہ دی جا سکے۔ یہی حال کاتب کا ہے وہ اُردو کے لئے رحمت بھی ہے اور زحمت بھی۔ لیکن نہ رحمت ہونے کے لحاظ سے اُسے جینے کی اجازت دی جا سکتی ہے نہ زحمت ہونے کے اعتبار سے سزائے قصاص کا مستحق قرار دیا جا سکتا ہے وہ ایک ہی جنبش قلم میں زندہ کو مردہ اور مردہ کو زندہ لکھ دیتا ہے مگر نہ اس پر مقدمہ چلایا جا سکتا ہے نہ معافی مانگنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ یورپ میں بڑی تحقیقات و جستجو کے بعد غلط چھپائی کا ذمہ دار ایک قسم کے شیطان کو قرار دیا گیا ہے۔ جسے شیطان طباعت کہتے ہیں۔ مگر ہندوستان میں ایسے ایسے ہزاروں شیطان روزانہ کاتب کے داہنے ہاتھ سے جنم لیتے ہیں۔ پھر بھی عہد اسلام سے آج تک اس سے یا اس کی اولاد سے پناہ نہیں مانگی گئی، کاتب خواہ کتنا ہی تجربہ کار اور قابل ہو

کوئی عقل مند اس کی نسبت یہ یقین نہیں کر سکتا کہ وہ ہمیشہ صحیح لکھے گا۔ معمولی کتابوں اور مضامین کا ذکر کیا ہے کاتب تو وہ بلائے بے درماں ہے جس کے ہاتھ سے صحیفہ آسمانی بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ چنانچہ یہ لطیفہ تقریباً سب ہی نے سُنا ہوگا کہ ایک عقل مجسم کاتب نے قرآن پاک کی کتابت کرتے وقت محض احترام کی خاطر شیطان کی جگہ کہیں اپنے پدر بزرگوار کا نام اور کہیں خاکسار مالک مطبع کے والد محترم کا نام رقم فرما دیا تھا۔

ممکن ہے عہد حاضرہ میں ایسے کاتب کی موجودگی سے انکار کر دیا گیا ہو مگر فائز کو "فائض" اور فاتر کو "خاطر" لکھنے والے کاتب تو آج بھی دستیاب ہو جائیں گے۔ ابھی حال ہی میں ہمارا ایک مضمون ندیم کے سالگرہ نمبر کے صفحہ تمت بالخیر پر شایع ہوا تھا اُس میں ہماری شامت اعمال سے ایک جگہ سدرۃ المنتھیٰ کا لفظ آیا چونکہ مضمون لکھا جا رہا تھا اس مقام پر جہان کتابت وطباعت کے قانون کے موافق، "در... مطبع مجتبائی کا زیور طبع گردید" لکھا جانا چاہیئے تھا۔ لہذا کاتب صاحب کا اِس موقعہ پر اصلاح سے باز رہنا قطعی جائز تھا۔ غالباً اُنہیں صحیح طور پر یہ معلوم نہ تھا کہ "سدرۃ المنتہٰی"، کسی فرشتہ کا نام ہے یا عرش وکرسی کے کسی حصّہ کو اِس نام سے موسوم

کرتے ہیں اور یہ گمان تو کسی طرح بھی نہ ہو سکتا تھا کہ عظیم الشان نام کسی پیڑ کا ہو سکتا ہے تاہم قرینہ، عبارت سے وہ یہ ضرور جان گئے کہ سدرۃ المنتہیٰ، کچھ بھی ہو ہے عرش اعظم پر اور کوئی وجہ نہیں کہ اتنے بلند و بالا مقام پر ہونے کے بعد اس کی کتابت میں قرأت سے کام لیا جائے چنانچہ آپ نے "س" کو "ص" سے بدل کر لکھا صدرۃ المنتہیٰ"، یعنی اگر کوئی اس کو بیر کا پیڑ سمجھنے والا۔ مولوی دیکھ لے تو مضمون نگار کو فوراً جاہل مطلق قرار دیدے۔ اسی طرح ایک طبی مضمون میں کسی جگہ "ہریسہ" کا لفظ آگیا۔ کاتب صاحب خیریت سے حج کر آئے تھے اور جانتے تھے کہ ہریسہ عرب کی مرغوب اور عام غذا ہے اور لکھنے والا مادر زاد ہندستانی ہے جسے یہ بھی نہیں معلوم کہ عرب کے اہل زبان اس کو قرأت کے ساتھ بولتے ہیں لہذا انھوں نے اصلاح فرمائی اور قادیانہ لب و لہجہ میں لکھا "حریصہ"۔۔۔

مگر ان حالات میں بھی کاتب کے نعمت غیر مترقبہ ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا جب کسی وقت یہ اپنے داہنے ہاتھ پر لاحول پڑھ کر اور زبان کو دانتوں سے دو انگل باہر نکال کر لکھنے بیٹھ جاتے ہیں تو اکثر برساتی مصنفوں اور موسمی مضمون نگاروں کی عیب پوشی بھی ہو جاتی ہے۔ جہاں کوئی غلط لفظ آجاتا ہے وہ فوراً اُس کی اصلاح فرما دیتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست کسی ادبی رسالہ میں

اپنا ترجمہ کیا ہوا افسانہ پڑھ رہے تھے پڑھتے پڑھتے دفعتہً چونک پڑے اور فرمانے لگے خدا غارت کرے اِس کاتب کو افسانہ کا سارا مطلب کھو دیا۔ کیا۔ ہوا ہم نے پوچھا۔

دیکھئے اُنھوں نے ایک لفظ کو قلم زد کر کے حاشیہ پر صحیح لفظ لکھنے کے بعد رسالہ ہماری طرف پھینکتے ہوئے فرمایا لکھا تھا یہ الفاظ اب بھی میرے لوحِ دل پر مرتسم ہیں۔ بدقسمتی سے نوجوان ادیب نے مرتسم کو کاٹ کر "مرتصم" بنا دیا تھا۔ ہم نے کہا برادر کاتب کا شکریہ ادا کیجئے کہ اُس نے آپ کی لاج رکھ لی۔ ورنہ ایسا بہتر ترجمہ جب اِس صحت اِملا کے ساتھ شائع ہوتا تو سارے ہندوستان میں آپ کو مرحوم سمجھ لیا جاتا۔

بہرحال کاتب جس وقت قلم سنبھال کر کاغذ کو آنکھوں سے ملا کر لکھنا شروع کر دیتا ہے تو ایک مضمون نگار کے لئے اِس کا قلم فضا میں پھٹنے والے "بم" اور سروں پر چمکنے والی تلوار سے بھی زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے۔ کاتب کی ایک عجیب خصوصیت یہ بھی ہے کہ مسودہ کتنا ہی روشن، صاف، اور صحیح لکھکر دیدیجئے اور خاص طور پر بار بار ہدایت بھی کر دیجئے کہ نقل مطابق اصل کا خیال رہے ایک نقطہ کا بھی فرق نہ ہو۔ لیکن وہ "کاتب" جس مقام پر چاہے گا آپ کی ہدایت کو ٹھکرا دیگا۔

ایک مشہور رسالہ کے مدیر محترم اپنی سوانح عمری تصنیف

فرما رہے تھے روزانہ دو تین جزو لکھ کر کاتب صاحب کو دیدیا کرتے تھے۔ پھر خوب غور سے کاپی پڑھتے تھے۔ مبادا کاتب صاحب نے اپنی اس خصوصیت کے ماتحت کوئی شگوفہ نہ چھوڑ دیا ہو۔

اگرچہ کاتب بڑے ہی ہوشیار اور قابل آدمی تھے اور نہایت احتیاط سے کتابت فرما رہے تھے

بہرحال تھے کاتب "... ایک جگہ مصنف نے لکھا تھا۔ میرے باپ نے اس وقت داعی اجل کو لبیک کہا جب میرے چھوٹے بھائی کی عمر جو مجھ سے پانچ سال چھوٹا ہے صرف دو ماہ کی تھی! کاتب صاحب نے لکھا۔

میرے باپ نے اُس وقت داعی اجل کو لبیک کہا جب میرے بڑے بھائی کی عمر جو مجھ سے پانچ سال بڑے ہیں صرف دو ماہ کی تھی! مصنف مدظلہ نے اس عبارت کو دیکھتے ہی کاپی پھاڑ کر پھینکدی۔ اور سخت طیش میں آکر فرمایا۔ اس کے آگے آپ ہی لکھئے۔ میں اس سلسلہ کو ختم کر رہا ہوں۔

ممبری

منجملہ اُن کاموں کے جن میں کسی اہلیت اور قابلیت کی ضرورت نہیں ہے وہ "ممبری" بھی ہے۔ لیکن ۱۹۴۳ء میں جس کے ایک حصہ میں ہم یہ مضمون سپرد قلم کر رہے ہیں۔ ممبری کا مفہوم

اور اس کے حدود بہت وسیع ہو گئے ہیں۔ چنانچہ خاندان کے ممبری سے لے کر کونسل اور میونسپلبورڈ کی ممبری تک بہت سی ممبریاں" واقع ہیں"۔ جن میں سے "ہر ممبری" خواہ اِس پر کوئی خانصاحب" ممتاز ہوں" یا لالہ جی" براجمان ہوں۔ زبردست وسعت کی حامل ہے۔ اِس جگہ ہم صرف اُسی ممبری سے بحث کرنا چاہتے ہیں جو ہزاروں دروازوں پر دست سوال دراز کرنے اور سینکڑوں "جانداروں" کی خوشامد سے حاصل ہوتی ہے۔ اِس موقعہ پر لفظ "جاندار" سے حیوان اور انسان کے درمیان کی وہ ہستی مراد ہے جو اگرچہ صورت کے لحاظ سے انسانی ہوتی ہے لیکن دنیوی امتیازات کے اعتبار سے اِس کو انسانوں سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا، اور اگر خدا نخواستہ "ممبری کا عنصر لطیف دنیا میں پیدا نہ ہوتا تو اونچی نسل کے انسان اِس "جاندار" سے ہمیشہ ناواقف ہی رہتے۔ اگر کوئی صاحب چاہیں جاندار" کا ترجمہ انگریزی زبان میں "ووٹر" کر سکتے ہیں۔

یہ تو بالکل مسلم ہے کہ لیلائے ممبری کی زلف پیچاں اسی شخص کے طائر دل کو اسیر کرنے میں کامیاب ہوتی ہے۔ جو ہر طرح "فارغ البلال" ہو۔ لیکن موجودہ زمانہ میں ہر مرض کا سبب کسی نہ کسی قسم کے کیڑے کو قرار دیا گیا ہے۔ ہمارے ایک دوست کی رائے میں ممبری کا مرض بھی ایک خاص نوع کے

"جراثیم" کی حملہ آوری کا نتیجہ ہے۔ ایک حد تک متعدی بھی ہے۔ یعنی ممبری ایسا اڑنے والا مرض ہے۔ جو ایک سے دوسرے کو اڑ کر لگ جاتا ہے۔ لیکن ہمیں اِس خیال سے متفق ہو جانیکی کوئی وجہ نہ تھی اگر ہمارے ایک عزیز دوست جو عرفِ عام میں "خانصاحب" کے مہیب نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ اِس بلا میں مبتلا ہو کر اس علمی حقیقت کا عملی ثبوت بہم نہ پہنچاتے۔

ہمارے یہ عزیز دوست "خانصاحب" اچھے خاصے آدمی تھے اور بظاہر ان کے دماغ کی تمام ساختیں صحیح و سالم تھیں۔ شام کو جب ہم اِن سے الگ ہوئے ہیں وہ قطعی تندرست تھے۔ لیکن صبح سویرے ہی ہمیں اطلاع ملی کہ اُن پر ممبری کا سخت بخار سوار ہے اور وہ ہذیان جو ایک سوتین کے بعد لازمی طور پر شروع ہو جاتا ہے اِن پر بھی طاری ہے۔ اگرچہ ہماری رائے میں یہ مرض بہت کم علاج پذیر ہوتا ہے اور اُس کے سوا اِس کی کوئی تدبیر نہیں کہ ممبر صاحب اگر کسی جائداد کے مالک ہیں تو اِس کو اِن کے قبضہ سے نکال لیا جائے یا اگر نقد روپیہ بدقسمتی سے اِن کے پاس ہے تو اِس کو چھین کر انہیں بالکل مفلس بنا دیا جائے۔ تاکہ گندی غذائے جو فسادِ عظیم اِن کے جسم میں پیدا کر دیا ہے باقی نہ رہے اور خدمت عوام کا ولولہ جو اکثر افراطِ زر کا تابع ہوا کرتا ہے سرد ہو جائے۔

ہم اپنے دوست کے پاس پہنچے تو وہ رائے دہندگان کی

ایک طویل فہرست لئے بیٹھے تھے اور بہت اطمینان کے ساتھ غور کر رہے تھے کہ اِس میں کون شخص ایسا ہے جس پر وہ اپنی زمینداری کا اثر ڈالکر اِس سے رائے حاصل کر سکتے ہیں۔ انھوں نے ہمیں دیکھتے ہی فہرست ہمارے سامنے ڈالدی اور کہا دیکھنا تمہارے قابو کے کتنے آدمی اِس میں ہیں! ہم نے کہا ایک بھی نہیں خفا ہو کر فرمانے لگے تم نے عمر بھر کیا کیا ہے۔

ہم نے کہا نوکری کی ہے جناب ۔ عُرّےئے "نہیں لڑائے کہنے لگے دیکھو کام کا وقت ہے۔ الکشن قریب آگیا ہے۔ میں نے پانچہزار کی تھیلی الگ رکھدی ہے۔ روپے کا منہ بالکل نہیں دیکھوں گا۔ شیخ جی کے مقابلہ میں کھڑا ہوں۔ دیکھوں گا ان کی مختاری کا زور! ایسا نیچا دکھایا ہو جو شیخ جی بھی یاد رکھیں۔

ہم نے تعجب سے کہا پانچہزار خانصاحب پانچہزار! کہاں سے آگئے۔ اُس دن انجمن اعانت ابیوگان کا وفد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا تو پانچ روپے بھی گھر میں نہ تھے۔ اب یہ پانچہزار کہاں سے لے آئے۔

خانصاحب نے اپنا منہ ہمارے کان کے پاس لاکر فرمایا۔ میاں چپ رہو۔ رقعہ لکھ کر لئے ہیں۔

آخر وہ دِن بھی آگیا۔ جس کے لئے خانصاحب نے پلاؤ کھلا کھلاکر "دوٹروں" کو "اصیل مرغوں" کی طرح پرورش کیا تھا اور

ایک رات پہلے جانوروں کے گروہ کو محفوظ مکان میں جمع کر کے تعلیم دی جانے لگی۔ لال صندوقچی ہے لال! ہاں سُرخ! اسی میں پرچہ ڈالنا۔ اچھی طرح سمجھ لو۔ لال، لال، سُرخ سُرخ صندوقچی!

رات بھر یہی آواز کان میں آتی رہی۔ صبح کو خانصاحب کے چھ سات آدمی اِن مویشیوں کو گھیر کر اسکول میں لے گئے (کانجی ہاؤس میں نہیں) جہاں پرچیاں ڈالی جارہی تھیں۔

خانصاحب کو بظاہر شیخ جی کے مقابلہ میں زیادہ کامیابی ہو رہی تھی۔ تاہم وہ بار بار "دشمن را حقیر و بیچارہ نہ باید شمرد" کا سیاسی جملہ دہرا رہے تھے اور جب کسی دوٹر پر ان کی نظر پڑتی تھی تو دوڑ کر اس کے ووٹ کی قیمت لگاتے تھے۔ ایک روپیہ۔ دو۔ اچھا۔ تین۔ بھائی نہیں مانتے۔ مروت بھی کوئی چیز ہے! کہاں چلے۔ اچھا سنو۔ پانچ! بس اِس سے زیادہ نہیں

فہرست سے مطابقت کرنے پر معلوم ہوا کہ پانچ آدمی رہ گئے ہیں جن میں سے دو پردیس میں ہیں۔ ایک مرگیا۔ ایک کا پتہ نہیں۔ پانچویں حافظ جی ہیں اور وہ سخت بیمار ہیں پلنگ سے اُٹھنے کی بھی طاقت نہیں۔

خانصاحب کو کب گوارا تھا کہ اِن کے محلہ کا ایک آدمی بغیر ووٹ دیئے مرجائے۔ اُنھوں نے حافظ جی کے بیٹے کو

بلا کر کہا کہ اپنے باپ سے ووٹ دلاؤ۔ اس غریب نے کہا وہ تو پلنگ سے بھی نہیں اُٹھ سکتے۔ خانصاحب نے فرمایا پلنگ سے اُٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔ پلنگ سمیت لے آؤ۔ وہ سائل ہوا۔ خانصاحب نے قیمت بڑھا دی۔ وقت ختم ہو رہا تھا۔ اسی مناسبت سے رائے کی قیمت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ آخر بیس روپے پر بیمار باپ کا غریب بیٹا زندگی میں باپ کا جنازہ اُٹھانے پر تیار ہو گیا۔ خانصاحب کے ایک سرگرم کارکن اس کے ساتھ ہو گئے اور خود کاندھا دیتے ہوئے حافظ جی کا پلنگ اُٹھا لائے۔

ہزاروں آدمی اسکول کے سامنے والے میدان میں جمع تھے۔ سب نے تالیاں بجا کر کہا۔ حافظ جی کا جنازہ آیا! پلنگ زمین پر رکھتے ہی خانصاحب نے حافظ جی کے سامنے آکر پوچھا کس کا پرچہ ڈالو گے حافظ جی!"

حافظ جی نے بیٹے کی طرف دیکھ کر کہا۔ کہاں لے آئے۔ ڈاکٹر صاحب کہاں ہیں۔ بھائی میں باز آیا اس ڈاکٹر ہی علاج سے مجھے گھر لے چلو۔

بیٹے نے گھبرا کر کہا۔ ابا آ گئے ہو تو خانصاحب کا پرچہ ہی ڈالتے چلو۔

بہر حال خانصاحب نے ان کا ووٹ حاصل کر لیا۔ اگرچہ

واپسی کے وقت حافظ جی کا پلنگ اُٹھانے کو آدمی میسر نہ آئے
خانصاحب الکشن کے ہجوم میں بتیا بانہ ادھر سے اُدھر بھاگے
پھر رہے تھے۔ اِن کے کارکنوں نے ایک بگڑے دِل دھقانی
کو بگڑ کہا تھا اور کہہ رہے تھے کہ پرچہ خانصاحب کا ڈالنا پڑیگا
خان صاحب بھی پہنچ گئے۔ وہ خان صاحب سے روشناس
نہ تھا۔ اِس نے خان صاحب کا نام سنتے ہی بگڑ کر کہا کون خاں
صاحب وہ بدمعاش جس نے میرے ماموں کو پٹوایا تھا۔ ہرگز نہیں
اُس پاجی کو کبھی پرچہ نہیں دوں گا۔ خانصاحب اپنی شان
میں یہ شاندار الفاظ سنتے ہی ایک فوجی سپاہی کی طرح
تیزی کے ساتھ ایڑیاں زمین پر جما کر دوسری... طرف
گھوم گئے اور یہ کام اُنھوں نے اتنی باقاعدگی اور چستی سے کیا کہ
دہقان کو محسوس بھی نہ ہو سکا کہ گھومنے والے کا اِدھر منہ بھی تھا۔
خدا خدا کرکے خانصاحب الکشن میں کامیاب ہوئے۔ سارے
قصبہ پر اِن کا اثر قائم ہو گیا۔ میونسپلٹی کے بھنگی جھک جھک کر
انہیں سلام کرنے لگے۔ بلکہ سڑک پر جھاڑو دیتے وقت انہیں
دور سے دیکھ کر رک بھی جاتے تھے اور خانصاحب کو بھنگیوں
کی یہ ادا بہت پسند آتی تھی۔
خانصاحب دو، چار کمیٹیوں میں شریک ہوئے۔ مگر اُنھوں نے
کسی معاملے میں زبان تک نہ ہلائی۔ وہ بہت ہمت کرتے تھے

کہ بولوں۔ مگر زبان بھاری ہو جاتی تھی۔ کانوں میں سنسناہٹ ہونے لگتی تھی۔ اور دل زور زور سے دھڑکنے لگتا تھا۔ اگرچہ وہ سمجھتے تھے کہ کمیٹی میں سب آدمی وہی ہیں۔ جن کے سامنے رات دن گفتگوئیں ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن ان سب کے مجمع میں کھڑے ہو کر بولنا خانصاحب کے بس کی بات نہ تھی ان کے رفقاء نے کہا خانصاحب کمیٹی میں چپ چاپ بیٹھے رہنا مناسب نہیں کبھی کبھی تو کچھ کہا کیجیئے خانصاحب نے فرمایا۔ اب کی مرتبہ ضرور تقریر کروں گا۔ اور ایک ضروری مسئلہ کمیٹی کے روبرو پیش کرونگا

خانصاحب نے گھر پہنچتے ہی اپنے مافی الضمیر کو کاغذ پر لکھا۔ اس میں کاٹ چھانٹ کی اور جب اطمینان ہو گیا تو اُسے حفظ کر لیا کمیٹی کے دن سب سے پہلے خانصاحب کھانس کر کھڑے ہوئے اور کھڑے ہوتے ہی اُنھوں نے مجمع پر فاتحانہ نگاہ ڈالی۔ پھر کانپتے ہوئے پیروں کو دیکھا اور دوبارہ کھانس کر فرمایا۔

صاحبوا ممبری (ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے) مذاق نہیں ہے (کھانس کر) اس میں سب طرف نگاہ رکھنی پڑتی ہے۔ جی ہاں (روانی کے ساتھ) ممبری مذاق نہیں ہے اس میں سب طرف نظر رکھنی پڑتی ہے آپ لوگ (کھانس کر) سڑکوں کی نالیوں ہی کو دیکھتے ہیں۔ حالانکہ سب سے ضروری بات (کھانسی) یہ ہے کہ (وقفہ) بان ندی کا پل درست کرایا جائے (جو میونسپلٹی کے دفتر سے

صرف دس میل کے فاصلہ پر واقع تھا) یہ برجستہ تقریر فرما کر خانصاحب کرسی پر بیٹھ گئے۔ چیرمین صاحب نے ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے کہا خانصاحب آپ ڈسٹرکٹ بورڈ کے ممبر ہیں یا میونسپل بورڈ کے۔

خانصاحب ایک تقریر کر چکے تھے اور نسبتًا اسکی جھجک کم ہو گئی تھی۔ اُنھوں نے اکڑ کر کہا۔ ڈسٹرکٹ بورڈ میں کیا لال ٹنکے ہیں۔ اِن میں کون سرخاب کا پر لگا ہوتا ہے۔ جو ہم میں نہیں ہے۔ یہ سب باتیں کام سے بچنے کی ہیں۔ صاحب پُل کی مرمت کرائیے

خانصاحب کی جماعت کے ممبروں نے کہا۔ خانصاحب بیٹھ جائیے پل کی مرمت ہم نہیں کر سکتے۔ ہماری حد میں پُل نہیں ہے۔

اچھا پل تمہاری حد سے باہر ہے تو میرے گھر کے سامنے کنوئیں پر لالٹین تو ضرور ہی نصب ہونی چاہیئے۔ رات کو دروازے کے سامنے بھی اندھیرا رہتا ہے اور پانی بھرنے والوں کو بھی تکلیف ہوتی ہے آخر میں نے ہی کیا قصور کیا ہے۔ سب ممبران کے مکانوں پر ایک ایک لالٹینیں لگی ہوئی ہے۔ بحث مباحثہ کے بعد طے ہوا کہ امسال روشنی کے سلسلہ میں جسقدر لالٹینوں کی منظوری ہوئی تھی۔ وہ سب لگائی جا چکی ہیں اور اِس معاملہ میں مزید تیاری کارروائی اختیار کرنا مناسب نہیں ہے۔

خانصاحب نے پھر فرمایا کہ سب لگائی جا چکی ہیں تو غفور کے

گھر کے سامنے والی لالٹین میرے مکان کے سامنے لگا دی جائے (کیونکہ غفور کا نام ووٹروں کی فہرست میں نہ تھا)۔

چیرمین نے کہا جس جگہ پہلے سے لالٹین ہے وہاں سے ہٹائی نہیں جا سکتی۔

خانصاحب کی بیوی اکثر علیل رہا کرتی تھی اگرچہ وہ علاج معالجے کے عادی نہ تھے۔ مگر جب میونسپل بورڈ میں ایک ڈاکٹرنی بھی ملازم تھی۔ تو کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ اپنی اس قدیم اور دہقانی جھینو جنیت کو ترک نہ کر دیتے۔ اُنھوں نے ڈاکٹرنی کے پاس ایک تحریر بھیجی کہ صبح مطب شروع کرنے سے پہلے روزانہ ہمارے "گھر کے لوگوں" (یعنی بیوی) کو دیکھ لیا کرو۔ (گھر کے لوگوں میں جمع کا صیغہ تعظیماً استعمال ہوا ہے ورنہ خیریت سے خانصاحب کے بیوی ایک ہی تھی) اِس غریب نے عذر کیا کہ دوسرا وقت مقرر کر دیا جائے قصبہ کی میونسپلٹی میں پندرہ ممبر ہیں اور سوائے ایک صاحب کے سب شادی شدہ ہیں مجھے دِن میں ایک مرتبہ سب کے مکان پر جانا پڑتا ہے۔ مطب شروع ہی نہیں کرتی کہ اِس سے پہلے آؤں اور مطب کی ضرورت ہی کیا ہے جب سب کے مکان پر مریضوں کا معائنہ کر کے دوا دے آتی ہوں۔

خانصاحب نئے ممبر تھے انہیں میونسپلٹی کے کاروبار کا زیادہ تجربہ نہ تھا۔ لیکن وہ تجربہ کار بننے کی کوشش کر رہے تھے تم انھوں

نے

نے دیکھا کہ دوسرے ممبران کے یہاں ایک ایک چمن لگا ہوا ہے اور میونسپلٹی کے سقے آبپاشی کے ذمہ دار ہیں۔

خانصاحب کے مکان میں کافی جگہ تھی انھوں نے فوراً باغیچہ لگانا شروع کر دیا۔ جب پانی دینے کا وقت آیا۔ تو اُنھوں نے سقوں کو حکم دیا کہ صبح آفتاب نکلنے سے قبل ہمارے باغ کو پانی دیا کرو۔ اُنھوں نے کہا۔ اسی وقت چیرمین صاحب کا چمن سینچتے ہیں۔ خانصاحب کم از کم اتنا ضرور جانتے تھے کہ چیرمین ممبر کے مقابلہ میں زیادہ بااثر ہوتا ہے اس لئے اُنھوں نے شام کا وقت مقرر کیا۔ لیکن اس وقت وائس پریذیڈنٹ صاحب کے چمن کو پانی دیا جاتا تھا بالآخر دوپہر کا وقت خانصاحب کے حصہ میں آیا۔

خانصاحب نے جمعدار اور سپاہیوں کو حکم دیا کہ دِن میں ایک مرتبہ ضرور سلام کر جایا کرو۔ تاکہ مناسب ہدایات دینے کا موقعہ مِل جایا کرے۔ لیکن اپنی ممبری کے تین سال میں اُنھوں نے جو ہدایات کیں وہ صرف بکرے کے گوشت، اِس کے نرخ اور عمدہ ہونے کے متعلق تھیں۔ یعنی یہ کہ بجائے چھ آنہ سیر کے ہمارے یہاں چار آنہ سیر آنا چاہیئے اور ہمیشہ دست ہی کا ہونا چاہیئے اِس میں ریشہ کم ہوتا ہے ہم میونسپل بورڈ کے ممبر ہیں۔ ہمیں اختیار ہے کہ جس بکری کو چاہیں پاس کردیں جس کو چاہیں رد کر دیں۔ کتاب جس وقت ہم چاہیں منگا سکتے ہیں۔

خانصاحب اپنے حلقہ کے مدارس کا معائنہ بھی فرماتے تھے اور اتفاق سے اکثر مدرسین ان کے عزیز تھے۔ اس لئے ان کے ہر معائنہ میں ترقی کی سفارش کے علاوہ اور کوئی بات نہ ہوتی تھی۔ البتہ جو مدرسین بدقسمتی سے ان کے رشتہ دار نہ تھے ان کو ہمیشہ تنزل کی دھمکیاں دی جاتی تھیں۔

کسی بیدار مغز ممبر نے طب قدیم کی لازوال خوبیوں سے متاثر ہو کر میونسپلٹی میں ایک یونانی شفاخانہ قائم کرنے کی تحریک کی جو اتفاق سے منظور ہو گئی۔

خانصاحب کے ایک عزیز کسی زمانہ میں "حکیم حاذق" کا امتحان دینے کی تیاری کر رہے تھے لیکن کتابوں کی اہمیت اور اپنی علمی کمزوری کے باعث انہیں اپنے ارادے کی تنسیخ پر مجبور ہونا پڑا۔ چنانچہ انھوں نے اس "خیال خام" کو ترک کر کے "سمیات کی فروخت" کا لائسنس حاصل کر لیا۔ اور بازار میں دوکان کھول کر بیٹھ گئے۔

جب طبیب کے انتخاب کا مسئلہ چھڑا اور کسی صاحب نے آصفیہ طبیہ کالج بھوپال کے ایک مشہور و معروف مستند کے لئے تحریک کی، تو خانصاحب نے فوراً اس کی تردید فرماتے ہوئے اپنے عزیز کا نام پیش کر دیا۔ اور سنداً فرمایا کہ وہ بہت حاذق حکیم ہیں سوال ہوا کہ کہاں تعلیم پائی ہے۔ ارشاد ہوا تعلیم نہیں پائی۔ خاندانی حکیم ہیں۔ مگر میونسپلٹی کے جاہل ممبر ان کو

خانصاحب کے خاندانی کالج کا علم نہ تھا۔ اس لئے اختلاف کیا اور خانصاحب کی تحریک کثرت رائے سے گر گئی۔

ہمارا خیال تھا کہ "خانصاحب" کا سراپا بھی اس مضمون میں شامل کر دیں۔ مگر اس کو ممبری سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لہذا فی الحال ایسا نہیں کیا گیا۔ انشاء اللہ آئندہ کسی موقعہ پر اس مقدس انسان کی قلمی تصویر کھینچنے کی کوشش کی جائے گی،

"ٹکر"

دنیا کے شدید حادثوں کی فہرست میں "ٹکر" کو ممتاز جگہ حاصل ہے کائنات کا ہر حادثہ کسی نہ کسی "ٹکر" ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ٹکروں میں بھینسوں سے لے کر ریلوں، جماعتوں۔ حکومتوں، تانگوں، سائیکلوں اور نگاہوں تک کی ٹکر داخل ہے۔ بھینسوں اور مینڈھوں کی ٹکریں تو کبوتر بازی اور مرغ بازی کی طرح محض تفریحات ہی میں شامل ہیں اور ان ٹکروں میں ادبیت صرف اتنی ہی ہو سکتی ہے جتنی خود بھینسے یا مینڈھے میں موجود ہے البتہ دوسری ٹکریں بعض اوقات کافی دلچسپیوں کا موجب ہو جاتی ہیں ریل کی ٹکر جو زمانہ حال میں ہوڑہ ایکسپریس اور کلکتہ لائن، کے لئے مخصوص ہو کر رہ گئی ہے۔ اگرچہ بجائے خود دلچسپ نہیں کہی جا سکتی

مگر بہت سے دلچسپ واقعات کی تخلیق کا سبب کہی جا سکتی ہے۔ چنانچہ جو لوگ ریلوں کے ٹکر کے کسی حادثہ میں شریک رہ چکے ہیں اُن کے دماغ پر اِس ٹکر کی مستقبل دلچسپیاں نقش ہو جاتی ہیں۔ اور اِس قسم کے آدمی جب ریل میں سفر کرتے ہیں تو کوئی نہ کوئی واقعہ ایسا ضرور ہو جاتا ہے جسے اِن کی بدحواسی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے لہذا کبھی ریل میں بیٹھے تو بہت ہوشیار ہو کر بیٹھے شاید کوئی آزمودہ کار زخمی بھی آپ کا ہم سفر ہو اور کسی وقت دفعتہً قیامت برپا کرنے پر تیار ہو جائے۔ ہم اپنے چند دوستوں کیساتھ رات کے وقت مراد آباد سے دہلی جا رہے تھے۔ ایک دُبلے پتلے آتشی مزاج کے مرزا بھی ساتھ تھے۔ اتفاق سے جگہ اچھی ملگئی تھی، سب پڑ کر سو رہے تقریباً تین بجے ہوں گے کہ مرزا جی نے لڑ گئی! لڑ گئی!! کہکر سامان نیچے پھینکنا شروع کیا۔ اور جو لوگ سو رہے تھے اُنھیں جھنجوڑ جھنجوڑ کر جگا دیا۔ ہمارے ساتھ بھی یہی عمل کیا۔

لڑ گئی، کیا لڑ گئی!

ریل......!

کہاں ہو گیا عقل جاتی رہی تمھاری؟

کیوں؟

کہاں لڑ گئی ریل؟

ابھی لڑی ہے یا لڑنے والی ہے۔ خدا کی قسم ٹکر ہونے میں کوئی کسر نہیں ہے۔ ہم نے جھانک کر دیکھا تو گنگا کا پل آچکا تھا اور گاڑی کسی وجہ سے رُک کر کھڑی ہو گئی تھی۔ معلوم ہوا ریل نے سیٹی دی، مرزا جی اس کی آواز سے چونک کر اُٹھ بیٹھے اور سمجھے ریلوں کی ٹکر ہو گئی، تھوڑی دیر بعد ہی گاڑی چل دی۔ اور مرزا جی کا قیمتی کمبل جو اُنھوں نے اپنے تکیوں کے ساتھ نیچے پھینکدیا تھا وہیں پڑا ہو گیا۔

ریل کی ٹکر اور کلکتہ کا سفر بہت حد تک ہم معنیٰ ہے۔ گذشتہ دو تین سال کی مدت میں کلکتہ کے راستہ میں ریلوں کی اتنی ٹکریں ہوئی ہیں کہ بہت سے کمزور دل کے ہندوستانی موت اور ریل کے سفر میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ بالخصوص کلکتہ کے سفر اور موت میں۔ چنانچہ جو حضرات گھر سے کلکتہ کے ارادہ سے چلتے ہیں وہ ریل کی ٹکر کے خوف سے جنازے کی شکل میں برآمد ہوتے ہیں۔ کفن سر پر تو نہیں ہوتا مگر بکس میں ضرور ہوتا ہے۔ دوسری ضروریات کے علاوہ ان کے ساتھ اس قسم کا کپڑا بھی ہوتا ہے جو زخمی ہونے کی صورت میں پٹیوں اور مر جانے کی حالت میں آخری لباس کا کام دے سکے۔ اور سامان سفر میں سب سے زیادہ اہمیت مذہبی چیزوں کی ہوتی ہے۔ جن میں تسبیح اور مصلے سب سے نمایاں ہوتا ہے۔ گھر سے اسٹیشن تک

قدم قدم پر مختلف اسماء پڑھے جاتے ہیں۔ دنیا کی بے ثباتی پر طرح طرح کی گفتگوئیں ہوتی ہیں۔ اور گاڑی میں پاؤں رکھتے ہی یہ سمجھ لیا جاتا ہے گویا قبر میں داخل ہو گئے۔ دہلی کے ایک باشندے جو کلکتہ میں ملازم تھے اور وہیں رہا کرتے تھے ریلوں کی ٹکروں کے حالات اخبارات میں بڑے شوق سے پڑھا کرتے تھے تھوڑے ہی عرصہ میں متعدد ٹکریں ہو چکی تھیں۔ اس وجہ سے انھوں نے وطن کا سفر ملتوی کر رکھا تھا۔ جب عرصہ تک کسی ٹکر کی خبر نہ آئی تو آپ بڑی مشکل سے دہلی جانے پر تیار ہوئے۔ خدا خدا کر کے دہلی تو پہنچ گئے، راستہ میں کوئی سانحہ نہیں ہوا۔ البتہ دہلی پہنچتے ہی معلوم ہوا ہوڑہ ایکسپریس مال گاڑی سے ٹکرا گئی۔ یہ سنتے ہی آپ کے ہوش وحواس جاتے رہے، اور محض، خود مردود رد ہانِ اثر دہا سے استدلال کر کے اعلان کر دیا کہ اب نوکری پر نہ جائیں گے۔ مبادا اثنائے راہ میں گاڑی کسی گاڑی سے ٹکرا جائے اور اِس طرح موت جس کے متعلق اب تک اِن کا ایمان تھا کہ وقت سے پہلے نہیں آتی۔ دو چار یا دس یا پانچ دن بیشتر ہی آجائے۔ سب جانتے ہیں کہ موت چاہے کتنی ہی یقینی ہو اس کے خوفناک ہونے میں کلام نہیں پھر بھی معقول ملازمت کا چھوڑ دینا خواہ کیسے ہی خطرناک عذر کی بنا پر ہو عقل کے خلاف ضرور ہوتا ہے اِس لئے سبب

کا مشورہ یہی ہوا کہ ایسا قدم اُٹھانے سے تو یہی بہتر ہے کہ دہلی کی سکونت ترک کر دی جائے اور کلکتہ میں مستقل قیام کر لیا جائے۔ احباب کے مخلصانہ مشوروں کا خلاصہ بھی یہی تھا اور اعزّہ کی رائے کا ماحصل بھی مجبوراً آپ کلکتہ جانے پر رضامند ہو گئے۔ اور اِس حادثہ کو خودکشی سمجھ کر دعوت دینے پر آمادہ ایک دن بڑے ساز و سامان کے ساتھ روانہ ہوئے، بیوی کو اِس طرح مختلف وصیتیں کیں گویا اب واپسی ہی نہ ہوگی۔

یہاں تکلیف ہو تو اپنے بھائی کے یہاں چلی جانا!

میرے بعد تمھاری خبر لینے والا یہاں کون ہے؟

بچوں کی نگہداشت تم اپنے ہی ذمہ سمجھو!

خدا نگہبان ہے اِن معصوموں کا۔

اِن سب کی صورتیں میرے دِل پر نقش ہیں۔

مرتے دم تک نہ بھول سکوں گا!

اچھا خدا کے حوالے!

سپردم بتو مایۂ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

دہلی میں اِن کے جتنے دوست تھے سب کے گھروں پر جا کر ملے اور آنکھوں کی روانی میں سب سے قصور معاف کرائے ایک صاحب نے پوچھا کیا ہندوستان سے باہر کہیں جا رہے ہیں آپ؟

بولے جی ہاں کلکتہ جا رہا ہوں!
کلکتہ تو ہندوستان ہی میں ہے۔
میں تو اسے دُنیا سے الگ سمجھتا ہوں۔
کیوں؟...۔ کیا خدانخواستہ وہاں کوئی ایسا خطرناک حملہ ہو گا جس میں آپ کے کام آجانے کا اندیشہ ہے؟
حملہ تو نہیں ہوا، البتہ ریل کے ٹکروں کا اکثر ڈر رہا کرتا ہے سوچتا ہوں ممکن ہے اِس مرتبہ بھی ریل لڑ جائے اور زندہ نہ بچوں!
فاتحہ وغیرہ سے بھی فارغ ہو گئے؟
کلکتہ کی گاڑی رات کے وقت جاتی تھی۔ آپ ایک بہت بڑے ہجوم کے ساتھ اسٹیشن پہونچے۔ راستہ میں جو شناسا مِلا اُس سے دوڑ کر معانقہ کیا اور دعائے خیر کی التجا کی، گاڑی چلنے سے نصف گھنٹہ قبل سب سے فرداً فرداً ملنا شروع کیا حالت یہ تھی کہ ڈاڑھی آنسوؤں سے تر ہوئی جا رہی تھی لبوں پر مختلف قسم کے مایوسانہ الفاظ تھے۔
دیکھئے اب ملاقات کا موقعہ بھی ملتا ہے یا نہیں؟
بھائی صاحب بچّے آپ کے سپرد ہیں!
بچّا، ذرا گھر کا خیال رکھیو!
اللہ کے حوالے خاں صاحب!
بھیّا خدا کو سونپتا ہوں۔

دعاؤں میں یاد رکھئے گا مولوی صاحب!

میاں جی لکڑیوں کا انتظام کر دینا گھر کے لئے!

اور ممکن ہو تو پورب سامنے دیوار ضرور اٹھوا دیجو!

جی ہاں بچّوں کا ساتھ ہے!

ملّا جی کل کو شاہ صاحب کے مزار پر چادر چڑھ جانی چاہیئے! اتنے میں گاڑی کی روانگی کا وقت آ گیا اور آپ ریل میں بیٹھ گئے۔ انجن نے سیٹی دی اور گاڑی نے سوڈا لمینڈ ٹھنڈا شربت پان بیڑی سگریٹ کی آوازوں میں اپنی جگہ سے جنبش کی۔ آپ بنڈی اور کرتے کے بٹن کھول کر کھڑکی میں کھڑے ہو گئے اور دونوں ہاتھ اٹھا اشاروں سے سلام کرنے لگے۔ ہاتھوں سے سلام کر رہے تھے اور زبان سے بار بار کہتے جاتے تھے۔!

کہا سنا معاف کرنا بھائی!

اللہ کو سونپا!

اب تو جاتے ہیں میکدے سے میر

پھر ملیں گے اگر خدا لایا ؏

احباب رخصت کر کے اپنے گھر چلے گئے۔ چوتھے دن کیا دیکھتے ہیں کہ جناب پھر دہلی کے احباب کو اپنی مع الخیر واپسی کا مژدہ سناتے پھر رہے ہیں۔ معلوم ہوا "ٹکرا" کے تازہ حادثہ سے قبلہ اتنے متاثر ہوئے کہ راستہ بھر دل دھڑکتا رہا۔ جہاں گاڑی نے

سلیٹی دی اور آپ کے حواس خراب ہو گئے ناشتہ دان میں کھانا رکھے رکھے سڑ گیا مگر کھانے کو طبیعت نہ چاہی۔ چند بار سنڈاس میں جا کر روئے بھی، بار بار رونے کی ضرورت سے اس "خلوت خانہ" میں جانے سے چند ہمدرد ساتھیوں کو "پیچش" کا شبہہ ہو گیا کہتے تھے بچوں کی صورتیں نگاہوں سے اوجھل نہ ہوتی تھیں ہر وقت آنکھوں میں پھرتی رہتی تھیں۔ کلکتہ تین چار اسٹیشن رہا ہو گا کہ یہ خیال یقین میں تبدیل ہو گیا کہ اس عرصہ میں گاڑی ضرور ٹکرا جائے گی۔ بالآخر دوسری گاڑی دہلی آتی ہوئی ملی آپ نے اپنا سامان اس میں منتقل کر دیا اور الحمد للہ کئی وقت کے فاقہ سے بخیر و عافیت دہلی واپس آ گئے۔

انسانوں کی ٹکروں کے واقعات عمومیت سے خالی نہیں۔ تاہم راستہ چلنے میں جب ایک راہگیر دوسرے راہگیر سے ٹکرا جاتا ہے تو اچھا خاصا مذاحیہ مضمون تیار ہو جاتا ہے۔

آنکھیں چرنے چلی گئی ہیں کیا؟

دیکھ کر نہیں چلتے!

کیا شراب پی کے چلے ہو گھر سے!

اور جو گلاس ٹوٹ جاتا!

اندھے کہیں کے!

اور بعض ستم ظریف تو ٹکر کا جواب چپت سے دیتے ہیں، ادھر

ٹکر ہوئی اُدھر اُنھوں نے ٹکرانے والے بدحواس کے منہ پر چپت رسید کیا۔
انسانوں کی ٹکر اس وقت اور زیادہ پُرلطف ہو جاتی ہے جب ایک صاحب ہاتھ سے کسی رنگین اور سیال چیز کا پیالہ لیے چلے آ رہے ہوں اور دوسرے صاحب کچھ سوچتے یا کوئی شعر گنگناتے محویت کے عالم میں سامنے سے اس طرح آ جائیں کہ ٹکرانے سے پہلے دونوں میں سے کسی کو خبر نہ ہو، پیالہ الٹ کر یا چھلک کر دونوں کے سفید کپڑوں کو رنگین کر دے۔ اور دونوں ایک دوسرے کو گھور کر کہیں، یہ کیا حماقت ہے؟
آنکھیں بند کر کے چلتے ہو!
کپڑے ستیاناس کر دیئے میرے!
اور میرے تو کپڑے بھی خراب ہوئے اور کڑھی بھی برباد ہوئی!
پھر آسمان کی طرف دیکھ کر کیوں چلتے ہو؟
بعض لوگ راہ چلتے اندھوں سے ٹکرا جاتے ہیں۔ لیکن ایسے موقعوں پر اندھا جواب اور سوال ہونے سے پہلے ہی اپنی مشہور عالم "لٹھ" کی امداد سے اپنی گذرگاہ صاف کر لیتا ہے۔ یہ ٹکرانے والے کی خوش قسمتی ہے کہ لاٹھی زور سے نہ پڑے آہستہ سے لگ جائے،
جماعتی ٹکریں ہندوستان میں اس کثرت سے ہوتی ہیں کہ ان کے متعلق کچھ لکھنا بیکار ہے۔ حکومتوں کے ٹکرانے سے دنیا

ہیں جو ہنگامہ برپا ہے وہ بھی سب کے سامنے ہے۔ البتہ نگاہوں
کے تصادم سے خدا سب کو نہیں تو کم سے کم مجھے ضرور بچائے
رکھے کسی نے کہا ہے۔

دو نگاہوں کا تصادم دو دلوں کا ارتباط!

میری رائے میں ارتباط، تصادم سے کم خطرناک ہی، شاعر نے
تو دو نگاہوں ہی کے تصادم سے پناہ مانگی ہے، لیکن اِس حادثہ کا
کیا ٹھکانا جب صاحبانِ نگاہ یک چشم نہ ہوں اور چار نگاہوں کی ٹکر ہو
اِس تصادم میں وہ سب کیفیتیں نمایاں ہوتی ہیں جو بہار، کوئٹہ
کے زلزلہ میں دیکھی گئی تھیں نگاہوں کی یہ ٹکر جب کسی پلیٹ فارم
پر عمل میں آتی ہے تو دِل کی کائنات اِسی طرح زیر وزبر ہو جاتی
ہے۔ جس طرح گاڑیوں کے ٹکر کے وقت مسافروں کی دُنیا۔ اکثر
صاحبانِ ذوقِ تصادم نگاہ کے حادثات کو دعوت دینے کے عادی
ہوتے ہیں۔ چنانچہ سفر کا آغاز کرتے ہی وہ آنکھیں لڑانے کی جرمنی
حرکت شروع کر دیتے ہیں۔ حریف چشم پوشی بھی کرتا ہے
جب بھی یہ ہٹلر کے انداز میں آنکھوں سے آنکھوں کی لڑائی کا
اعلان کر دیتے ہیں۔ اور جب تک پسپائی کا اعتراف نہیں کر لیا
جاتا یہ حملہ پوری جارحانہ سرگرمیوں کے ساتھ جاری رہتا
ہے۔ درحقیقت دُنیا ٹکروں کے مجموعہ کا نام ہے۔ اِس لئے
اِن ٹکروں کے علاوہ اور بہت سی ٹکریں ہوتی ہیں۔ مثلاً مولویوں

کی ٹکر، شاعروں کی ٹکر، مگر اِن سب کو ایک جگہ جمع کر کے مضمون کو میدانِ جنگ بنا دینا مناسب نہیں۔ لہٰذا فی الحال اِس کھٹ پٹ کو یہیں ختم کر دینا بہتر ہے۔"

تعریف

نشہ کے متعلق عام طور پر، لوگوں کا خیال ہے کہ شراب، بھنگ، افیون، اور اِسی قسم کی نشئی چیزوں کے استعمال کا نتیجہ ہے۔ مگر دنیا میں ایسے پاک دامن لوگ بھی موجود ہیں جو اپنے زہد و تقدس کے لحاظ سے نشہ آور اشیاء کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے۔ پھر بھی اِن کے "حواس خمسہ" کسی خمار آگیں کیفیت کے اثر سے معطل رہتے ہیں غور کرنے سے معلوم ہوا کہ منشیات اور مسکرات کے علاوہ بھی ایسی چیزیں ہیں جو انسان کو مخمور بنا دیتی ہیں۔ اگرچہ کسی قانون کی رو سے اِن کا رواج ممنوع نہیں تاہم اِن کی سکر آفرینیوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اِن میں سب سے زیادہ کیف انگیز اور خمار آفریں چیز ہے "تعریف"

کھانے پینے کی چیزوں کا تعلق منہ سے ہے مگر یہ نشہ کانوں کے ذریعہ انسان کے رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے اور کام و دہن کو مطلق کوئی خدمت انجام دینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ جو حضرات منشیات کو سم قاتل سمجھتے ہیں وہ بھی کانوں

سے اِس بادۂ تحریک کو بے تکلف پی جاتے ہیں۔ اور دل و دماغ میں ایک نئی زندگی، نئی روح، اور بہت سی اجنبی کیفیات کو دوڑتے پھرتے محسوس کرتے ہیں۔

بخیل کو فیاض، بزدلی کو بہادر، کاہل کو محنتی، اور بیکار کو مشغول بنا دینے میں تعریف نہایت موثر ثابت ہوئی ہے۔ زمانۂ موجودہ میں جبکہ خودداری اور عزتِ نفس کے جذبات نے نوجوانوں کے دلوں میں آشیانہ بنا لیا ہے "تعریف" کو "چاپلوسی" کا خطاب دیدیا گیا ہے مگر اس توہین سے اِس کی کثرت اور ہمہ گیری پر اب تک کوئی کاری ضرب نہیں لگی۔ اور چند دن کے جلسوں سے لیکر "دعوتوں" کی مجالس تک تعریف کی پوشیدہ طاقتیں کارفرما نظر آتی ہیں۔

ایک بہت ہی بخیل دولتمند تھے جنکی آمدنی کا کم سے کم حصہ بھی چندے کے ناجائز مصرف میں کام نہ آیا تھا۔ بڑے بڑے آتش مقال شاعر اور آگ لگا دینے والے مقرر، اِن کے دل میں سوز و گداز پیدا کرنے پر قادر نہ ہوئے تھے، صاحبانِ اثر و اقتدار کی التجائیں بھی کامیاب مدعانہ ہوئی تھیں۔ لیکن حال ہی میں ایک ماہر نفسیات کا ورود مسعود ہوا۔ اور انھوں نے پہلی ملاقات ہی میں سمجھ لیا کہ موصوف کس خطرت! اور دل و دماغ کے انسان ہیں۔ چنانچہ جلسے میں تقریر کرتے وقت جب انھوں نے

در پس ہر گریہ آخر خندہ ایست
بعد ہر اسپیچ آخر چندہ ایست

کے اصول پر چندے کا سوال کیا۔ اور حاضرین جلسہ حسب عادت اس تلخ موضوع کی تاب نہ لاکر روانگی پر آمادہ ہوئے تو مقرر نے برجستہ کہا مجھے معلوم ہے اس قصبہ میں بڑے بڑے صاحبانِ خیر رہتے ہیں یہ دوسری بات ہے کہ نام آوری کو پسند نہیں کرتے اور عام جلسے میں لوگوں کو دکھا کر چندہ نہیں دیتے مگر پوشیدہ طور پر ان کا ہزاروں روپیہ غریبوں پر صرف ہوتا ہے۔ حقیقت میں یہی لوگ مادرِ وطن کے سپوت اور خادم ہیں۔ ایسے حضرات میں سب سے پہلا نمبر ہمارے محترم دوست کا...... ہے۔

آخری جملہ ممدوح کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا تھا۔ وہ اپنی تعریف میں یہ قصیدہ سنتے ہی جھومنے لگے۔ چونکہ آج پہلی مرتبہ انھوں نے یہ کیف آور گھونٹ پیا تھا۔ اس لئے رگوں میں عجیب قسم کا سکون اور اعصاب میں بالکل نئے انداز کا سرور پیدا ہو گیا دل فرحت وانبساط کے خون سے لبریز ہو گیا آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ چہرہ سُرخ ہو گیا انھوں نے نہایت عجلت میں اپنے اعمال اور کردار کا جائزہ لیا۔ لیکن ایسا کوئی واقعہ بھی حافظہ نے پیش نہیں کیا جس سے تعریف کا ایک لفظ بھی سچا ثابت ہو سکتا۔ مگر جادو بیان مقرر نے دکھتی ہوئی رگ پکڑلی تھی اور اس مقام پر

پلوٹ لگائی تھی جواب تک محفوظ تھا۔

ممدوح کو اپنا بھرم بھی رکھنا تھا۔ اور اپنے اندر وہ صفات بھی پیدا کرنی تھی جو ابھی بیان کی گئی تھیں لہذا جیب سے بٹوہ نکال کر انھوں نے پانچ سو روپیہ کے نوٹ نہایت آہستگی اور خاموشی سے نکالے پھر اشارہ سے مقرر کو بلایا اور پھر وقد کھڑے ہو کر یہ حقیر رقم ملک کے ایک یتیم خانے کو دیدی۔ ہر شخص حیران تھا یہ کیا طلسم ہے۔

رفتہ رفتہ انہیں اس نشہ کی عادت ہوگئی جس طرح شراب کا خمار اُتر جانے پر جسم کا بند بند دکھنے لگتا ہے۔ تعریف کے الفاظ نہ سنتے تو انہیں بھی جمائیاں آنے لگتیں اور خود ہی وہ کسی عنوان سے اپنی تعریف شروع کر دیتے۔

ارباب عقل و دماغ دیکھ چلے تھے۔ مقرر نے کس اصول سے کامیابی حاصل کی تھی۔ چنانچہ اب ہر وقت در دولت پہ کافی ہجوم رہنے لگا۔ اور نئی نئی تعریفیں بیان کی جانے لگیں۔ ایک دن کسی نے کہا، جناب کے متعلق یہ تو سب ہی جانتے ہیں نہایت خوش پوشاک، اور خوش خور ہیں۔ مگر یہ بات بہت کم حضرات کو معلوم ہوگی کہ دسترخوان بھی نہایت وسیع رکھتے ہیں۔ دونوں وقت دس بیس آدمی جب تک نہ ہوں کھانا تناول نہیں فرماتے۔

ش

یہ سنتے ہی انھوں نے انداز تفاخر سے اپنے کپڑوں پر نظر ڈالی۔ سوئے اتفاق سے شیروانی نہایت میلی اور کم قیمت تھی پاجامہ بھی معمولی کپڑے کا تھا۔ فوراً نگاہیں پھیر لیں۔ اور مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد ہوا اجازت ہو تو کپڑے بدل لوں۔ ویسے ہی باہر آگیا تھا۔ ابھی پانچ منٹ میں حاضر ہوتا ہوں۔

کسی کو اختلاف کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی اِن کے اندر جانے سے بہت سی توقعات وابستہ تھیں۔ چنانچہ وہ کپڑے بدل کر باہر آئے تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ملبوس اِن کے جسم پر تھا جسکو انھوں نے کسی خاص تقریب کے لئے تیار کرایا ہوگا۔ باہر آتے ہی ارشاد ہوا۔ چار بج چکے ہیں کوئی ہرج نہ ہو تو چائے حاضر کی جائے۔

سب نے باتفاق کہا، کیا مضائقہ ہے!

فوراً ملازم کو چائے لانے کی ہدایت کی گئی اِس نے بہت تیزی سے تعمیل کی۔ نہایت تکلف سے چائے آئی۔ چائے بھی تھی اور متعدد قسم کے بسکٹ۔ حلوے اور دوسرے لذیذ ناشتے بھی تھے۔

ایک صاحب حیرت سے بولے اوفوہ اتنی جلدی یہ اہتمام کیونکر ہو گیا؟

دوسرے صاحب نے جواب دیا۔ اہتمام کی کیا ضرورت ہے یہاں تو ہر چیز تیار ہی رہتی ہے۔ آخر آپ خود بھی تو اِسی شان

و شوکت سے چاء پیتے ہیں۔ اور چائے پر ہی کیا موقوف ہے۔ میں نے اکثر دیکھا کہ وقت کے وقت دس بیس آدمیوں کے کھانے کا حکم ہوا، اور فوراً اندر سے کھانا آگیا۔ پھر کھانا بھی کیسا؟ نہایت پر تکلف!

ممدوح کا چہرہ مسرت و شادمانی سے سرخ ہو گیا۔ سانس کی حرکت معمولی سے زیادہ تیز ہو گئی۔ اور ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ارشاد ہوا۔ واقعی کوئی اہتمام تو نہیں کیا گیا! چائے پی کر پورا طائفہ، وہیں رونق افروز رہا اور دانستہ کھانے کے وقت کا انتظار کیا گیا جب وقت قریب آگیا تو سب نے اجازت طلب کی۔ حکم ہوا کھانے کا وقت ہو گیا، ماحضر بھی تناول فرماتے جائیے۔

"کوئی تکلف تو نہیں، مگر آدمی زیادہ ہیں!"

"اس کا خیال نہ فرمائیے" یہ کہہ کر ملازم کو ہدایت کی گئی کہ جلد کھانا لاؤ۔ لیکن کوئی خاص اہتمام نہ ہو۔ جو روزانہ کھاتے ہیں بس وہی لے آؤ۔ سب اپنے ہی آدمی ہیں کوئی غیر نہیں ہے۔

چنانچہ کھانا بھی اسی عجلت سے آگیا جس تیزی سے چائے آئی تھی۔ کھانے کے اقسام اور انواع بہت زیادہ حیرت انگیز نہیں خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ تکلف کی قطعی ممانعت کر دی گئی تھی۔ اگرچہ دانشمند احباب سمجھتے تھے کہ اس کی اصلیت

کیا ہے اور کتنی دیر سے تیاری ہو رہی تھی۔ کتنی مرتبہ ملازم بازار گیا۔ اور آیا۔ اور یہ کہ روزانہ وہ کیا کھاتے ہیں۔ تاہم اِس قسم کے تذکروں کا یہ محل نہ تھا چنانچہ ایک صاحب بولے سبحان اللہ دسترخوان کیا ہے جے پور کا عجائب خانہ ہے کہ ہر چیز موجود ہے بہت سی چیزوں کا تو یہ موسم ہی نہیں۔ مگر خدا جانے آپ کے یہاں کتنا ذخیرہ رہتا ہے کہ روزانہ کھانے میں آتی ہیں۔ جی ہاں! اُنھوں نے کہا وہ چار کھانوں سے تو پیٹ بھی نہیں بھرتا "بیشک! اور میں تو کہتا ہوں آپ تنہا بھی کبھی نہیں کھاتے"!

"تنہا تو واقعی میں نہیں کھا سکتا۔ یوں سمجھیے کہ تقریباً دس سال سے شام کا کھانا اندر نہیں کھایا اکثر عنایت فرما آجاتے ہیں اور بندہ نوازی کے طور پر شریک طعام ہو جاتے ہیں پہلے کی نسبت زیادہ فخر و مباہات سے اُنھوں نے کہا،

"گذشتہ دس سال کی نسبت تو نہیں کہا جا سکتا کہ اِن کا یہ قول صحت و واقعیت پر مبنی ہو البتہ آئندہ دس سال کی نسبت اِس کے غلط ہونے کا قطعی امکان نہیں۔

ایک دِن کسی ظریف نے کہا، سُنا ہے جناب کے یہاں بسکٹ بہت اچھے بنائے جاتے ہیں؟

"ایک بسکٹ ہی پر کیا موقوف ہے کیک اور نان خطائی بھی نہایت لذیذ تیار ہوتی ہے"!

خوب! لیکن ابتک کھانے کا اتفاق نہیں ہوا" وہ سُنکر خاموش ہو گئے۔ اگلے دِن شام کو اجتماع ہوا تو چار کے ساتھ اسی قسم کی چیزیں آئیں اور حقیقت میں نہایت اچھی تھیں۔

بہر حال تعریف میں وہ اثر ہے جو عادات وخصائل اور اخلاق واطوار کو بھی بدل دیتا ہے۔

خرّاٹے

انسان کے بہت سے اضطراری اور اختیاری افعال شعر و ادب میں دخیل ہیں۔ مثلاً تبسم، ہچکی، انگڑائی، شعر و ادب کی جان ہیں اگر اِن کو پچاس سال پہلے کی شاعری سے خارج کر دیا جائے تو شاعری کا سرمایہ اتنا ہی رہ جائے جتنا کونین اور ٹنکچر چھین لینے کے بعد طب جدید کا، مگر تعجت ہے کہ ہندوستان کے کسی شاعر نے خرّاٹوں پر طبع آزمائی نہیں کی، ممکن ہے۔ محبوبوں کی اقوام جرائم پیشہ سے خرّاٹوں کا کوئی تاریخی علاقہ نہ ہو مگر عشاق کے مُنہ سے تو ہم نے اکثر خرّاٹوں کی آواز نکلتے سنی ہے۔ شاید اِس فعل کو شعرا نے وحشیانہ سمجھ لیا اگر یہ بات ہے تو صاحبان شعر کا یہ بڑا ظلم ہے آخر اِس میں انسان کا قصور ہی کیا ہے کہ سونے میں اِس کے مُنہ سے خرّاٹوں کا الارم بجنے لگتا ہے، یہ تو ایک غیر اختیاری بات ہے کہتے ہیں نیند موت

کی چھوٹی بہن ہوتی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو خرّاٹوں سے بے اعتنائی برتنا یا انہیں وحشت و بربریت کی علامات میں شمار کرنا قرین انصاف نہیں خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ خراٹوں کی حماقت کو صرف عاشقانہ اشغال ہی سے مخصوص نہیں کیا جا سکتا بلکہ اکثر موٹے تازے محبوب بھی خرّاٹے لینے کے عادی ہوتے ہیں۔ اور آنکھ جھپکتے ہی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بیکس و لاچار عشاق کے خلاف کوئی زبردست محاذِ جنگ قائم کر دیا۔ رہے آس پاس کے سونے والے بزدل انسان جو کسی کے خرّاٹوں کا شور و غوغا سنکر بیتابانہ اُٹھ بیٹھے ہیں اور یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اِن کا کمرہ بلیوں کی زور آزمائی کا اکھاڑہ بن گیا ہے، تو یہ خود ان کی کمزوری ہے، آخر بہت سے شیر دل ہوائی جہازوں کی پرواز کے وقت بھی مارے ڈر کے بیہوش ہو جاتے ہیں اِن کی بزدلی کی رعایت سے کوئی فوجی کارروائی تو ملتوی ہونے سے رہی پھر خرّاٹے لینے والے کیوں مجرم قرار پائیں جبکہ یہ "نغمۂ خواب"، گہری نیند ہی کے وقت ہونٹوں کے ساز پر بجتا ہے، اگر جاگتے میں یا نیم بیداری کے عالم میں ایسا ہوتا تو یقیناً خرّاٹوں کو کم سے کم شرارت پر محمول کیا جا سکتا تھا۔ باوجود اِن تمام باتوں کے دیکھا جاتا ہے کہ اکثر جوڑے محض خرّاٹوں کی وجہ سے بچھڑ جاتے ہیں، یا فریقین میں سے کوئی ایک فریق یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ اِس کے رفیق زندگی پر آسیب جن یا پری کا سایہ ہے، ہمارے ایک دوست جو بہت زیادہ نازک

مسزاج اور تکلف پسند ہیں اتفاقاً حادثہ ازدواج سے دوچار ہوگئے یہ سانحہ کم سے کم اُن کے لئے غیر متوقع تھا چنانچہ ہم نے بطور تعزیت دریافت کیا۔ بھائی یہ کیا انقلاب ہوگیا،...... شادی کا آتش فشاں آپ کے گھر میں کیونکر اس طرح پھٹ پڑا؟

وہ ہنسکر فرمانے لگے، بس یوں سمجھ لیجیے کہ دہرہ ایکسپریس کی مال گاڑی سے ٹکر ہوگئی ظاہر ہے کہ ٹکر کبھی جان بوجھ کر نہیں ہوا کرتی بلکہ یوں ہی اتفاقیہ طور پر ہو جاتی ہے۔ یہی صورت اس حادثہ فاجعہ کی ہوئی، یعنی ایک ہلکا سا رومان شادی کی صورت میں جلوہ گر ہوگیا شادی اور رومانی!...... پھر تو آپ قابل مبارک باد ہیں؟

جی ہاں کم سے کم نصف مبارک باد کا استحقاق ضرور رکھتا ہوں یہ کیوں؟..... کیا یہ رومان بغیر عقد ہی کے شادی بن گیا نہیں یہ بات نہیں، اصل وجہ یہ ہے کہ ہم نے معاہدہ حالت بیداری میں کیا تھا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ...... انہیں سونے میں خراٹے لینے کی عادت ہے۔ جب وہ سوتی ہیں حسن و جمال کی کوئی خصوصیت خراٹوں کی کراہٹ اور ہیبت کے مقابلہ میں باقی نہیں رہتی، البتہ جب تک جاگتی ہیں انہیں حسن مجسم سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ سونے کی مدت جاگنے کی مدت سے زیادہ ہوتی ہے۔

محض خراٹوں کی وجہ سے آپ نے ایک محترم خاتون کو اِن خصوصیات سے کیوں محروم کر دیا جن کی وہ مستقل طور پر مالک ہیں؟

سنئے جناب! وہ بولے بات یہ ہے کہ میں آدمی ہوں شاعر قسم کا اور اساتذہ سے لے کر موجودہ زمانہ کے شعراء تک کے کلام میں کہیں خراٹوں کا تذکرہ نہیں، کسی ایک شاعر نے بھی اس کو شباب و رعنائی میں شامل نہیں کیا پھر میرا دل بھی ذرا کمزور ہے۔ رات کو کمرے میں جب اُن کے خوفناک خراٹوں کی آواز چھت سے ٹکرا کر واپس آتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آسمان سے موت کا فرشتہ نازل ہو رہا ہے....." اور آنکھیں بند کر کے تصور کیجئے تو بالکل یہ معلوم ہوتا ہے کہ محلہ والے خانصاحب کی ایرانی بلی، ہماری ولایتی بلی سے لڑ رہی ہے اور بلیوں کی لڑائی سے مجھے ہمیشہ نفرت رہی ہے۔ چنانچہ یہی ہوتا ہے کہ جب سوتے سوتے ایک دم "بلی" بن جانا چاہتی ہیں تو میں انہیں جھنجھوڑ کر اُٹھا دیتا ہوں، اِس حرکت پر وہ خفا تو بہت ہوتی ہیں، بگڑتی بھی ہیں اور بد مزگی کا اظہار بھی کرتی ہیں مگر یہ... چیزیں خدا رکھے خراٹوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ خوشگوار ہوتی ہیں۔ ہم دونوں آرام سے اپنی اپنی مسہریوں پر سو جاتے ہیں تو دفعتہً ان کے خراٹوں کی خر خر، خر خر

سے چونک کر میں بیدار ہو جاتا ہوں اور انہیں جگا کر کہتا ہوں، تمہارے ساتھ بلی سو رہی ہے وہ پوری قلوپطرائیت کے ساتھ خون آشام تیوروں سے مجھے دیکھ کر کہتی ہیں.... سونے دیجئے!

اِس طرح ہم دونوں بیخوابی کی اذیت میں مبتلا رہے ہیں!

یہ غریب تو خیر مرد تھے اور بزدل ہونے کے باوجود انہیں مرد ہی کہا جائے گا۔ لیکن جب صنفِ لطیف کی نازک اندام ہستی کو کسی تنومند آدمی کے خرّاٹوں سے واسطہ پڑ جاتا ہے تو اُن کی عجیب کیفیت ہوتی ہے ایک مرتبہ ہم ریل میں سفر کر رہے تھے۔ یوں تو ہم سفر بہت سے تھے، مگر ایک صاحب اپنے مٹاپے، اور رنگت کے عجیب و غریب آبنوسیت نیز سرمایہ دارانہ "توند" کی بنا پر بہت ممتاز تھے۔ جب بنچ پر سیدھے لیٹ کر وہ سانس لینا شروع کرتے تو سارے مسافروں کی آنکھیں اِن کی توند پر مرکوز ہو جاتیں بلا مبالغہ ایسا معلوم ہوتا کہ جمنا جی کے ریت میں کوئی بڑا سا مگرمچھ پڑا ہوا ہانپ رہا ہے، یا ایک دھونکنی ہے جو تیز تیز چل رہی ہے۔ موصوف کے ساتھ انہیں کی بھاشا میں اِن کی استری بھی تھیں اور ایک چھوٹا سا بچہ بھی، جب کوئی تازہ مسافر گھبرایا ہوا ڈبہ میں داخل ہوتا اور ان کی طرف آتا تو وہ اپنے دونوں ہاتھ آگے کو پھیلا کر کانپتی ہوئی آواز میں کہتے۔ ادھر ہی رہو استریوں میں مت بیٹھو برسات کا زمانہ تھا شاید کنوار کا مہینہ لگ چکا تھا کالے بادل آسمان پر چھائے ہوئے تھے

دیکھنا شروع کیا، ہم نے بھی پھر کر دیکھا۔ موصوف ناک کے نتھنے پھیلائے ہونٹوں کو پھونک مارنے کے انداز سے کھولنے اور بند کرنے میں مصروف تھے اور مُنہ سے خراٹوں کی شفقت شکن آواز بلند ہو رہی تھی، ان کی بیوی جو کافی ہنس مکھ تھیں انہیں اِس طرح بلبلاتا دیکھ کر شرما سی گئیں اور جب خرڑ..... خرڑڑڑ کی مسلسل آوازوں نے ڈبہ کو روس کا محاذ جنگ بنا دیا تو انھوں نے ہاتھ بڑھا کر شوہر کے بازو کو ہلا کر کہا۔ کیا کر رہے ہو۔

اُنھوں نے چپ چپ کی دو تین آوازیں مُنہ سے نکالیں اور اپنے مُنہ پر ایک ہلکا سا چپت مار کر لال لال آنکھیں کھولیں اور گھبرا کر پوچھا....... ٹوپی گر گئی کیا؟ اور پھر آنکھیں بند کر لیں پندرہ بیس منٹ کی خاموشی کے بعد پھر وہی خرڑ..... خرڑڑڑ ہونے لگی اِس مرتبہ آوازیں ذرا اتار چڑھاؤ بھی تھا۔ خاتون پھر گھبرائیں اور چاہتی تھیں کہ انہیں جگائیں مگر ہم نے کہا آپ کیوں اِن کی نیند خراب کرتی ہیں سونے دیجئے گھر پر بھی تو یہی کرتے ہونگے۔

نہیں آج دودھ زیادہ پی گئے ہیں!

پھر اِس کے ہضم کرنے کی صورت اگر یہی ہے تو جگانا نقصان سے خالی نہیں۔

اور ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ کبھی کبھی بجلی بھی چمک جاتی تھی انجن کی
روشنی میں جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی پانی اور سبزہ ہی نظر آتا تھا
ہوا میں ایک خاص قسم کا نشہ تھا اور ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے لوریوں
کا کام کر رہے تھے اچھے خاصے آدمی بیٹھے اونگھ رہے تھے یہ تو مٹاپے
کی وجہ سے ویسے ہی بھلے آدمی تھے۔ غرض ایک خوبصورت
پھولدار تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹ رہے، اور لیٹے بھی سیدھے
کروٹ سے لیٹنا تو اس لئے مشکل تھا کہ دیوار کی طرف مُنہ کرتے تو
پیٹ دب جاتا اور دوسری طرف رُخ کرتے تو "توند" سرزمین آزادی میں
پھیل کر قابو سے باہر ہو جاتی مجبوراً سیدھے لیٹے اور بچہ کو چھاتی
پر ڈال لیا پیٹ کی دلچسپ اور مسلسل حرکتوں نے تکیہ دار جھوجھو
کا کام کیا اور بچہ ذرا سی دیر میں بے خبر ہو کر سو گیا، رات کے بارہ
بجے تھے ڈبہ میں سنّاٹا تو ویسے ہی تھا مگر اس وقت خاص طور
پر گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی اکثر مسافر پاؤں پھیلائے سو رہے
تھے۔ بعض بیٹھے بیٹھے اس انداز سے اونگھ رہے تھے کہ کبھی
دو مسافروں کے سر ٹکرا جاتے اور جھٹ آنکھیں کھول کر ایک
دوسرے کو دیکھنے لگتے، کبھی گردن ڈھیلی کر کے جو آگے کیطرف
کوئی لہرا کر گرتا تو کسی بکس یا گٹھری پر اوندھا ہو جاتا اس سناٹے
میں خررر ڑ.... خرڑڑڑ کی ایک آواز گونجی بہت مہیب
اور ڈراؤنی آواز، مسافروں نے آنکھیں کھول کر چاروں طرف

بچّہ ڈر جائے گا!
کیا اسے عادت نہیں باپ کے خراٹے سُننے کی!
ہاں اکثر ڈر جاتا ہے!
اتنے میں انھوں نے ذرا ڈانٹ ڈپٹ کے ساتھ خر ڑ خر ڑڑڑڑ کا تانتا باندھ دیا اور بچہ سوتے سوتے اتنے زور سے چیخا کہ سارے مسافر ادھر متوجہ ہو گئے۔ چیخ کے ساتھ بچہ کا پیشاب بھی نکل گیا تھا جس کی معتدل گرمی نے اِس ٹینک نما آدمی کو بیدار کر دیا اُنھوں نے اٹھتے ہی آہستہ سے بچّہ کی کمر پر ہاتھ مار کر کہا..... مُوت دیا بدمعاش!
بیوی نے کہا ڈر گیا، مارو مت۔
کاہے سے ڈر گیا انجن نے سیٹی دی ہوگی۔
نہیں تم ہی چیخ رہے تھے سوتے میں۔
ہیں؟ اُنھوں نے غور سے بیوی کو دیکھ کر پوچھا۔
ہاں تم!..... خراٹے نہیں لے رہے تھے ابھی ابھی۔ میں نے آج تک کبھی خراٹے نہیں لئے یہ آج کیا ہو گیا؟
جب انھوں نے دیکھا سب ان کی باتوں کو غیر معمولی دلچسپی سے سن رہے ہیں تو ذرا کھسیانے ہو کر بولے، بالک ہے بالک! چلو تھپک کر سلا دو۔
خراٹے لینے والے تیمار دار جب کسی بیمار پر مسلط ہو جاتے

ہیں تو بڑی مشکل ہوتی ہے، جب تک جاگتے رہتے ہیں دوسروں کو آہستہ بولنے بلکہ چپ رہنے کی تلقین کرتے رہتے ہیں اور جب سو جاتے ہیں تو اپنے رجزیہ خراٹوں سے رات کے سکوت کو زیر و زبر کر ڈالتے ہیں ایک بڑے عہدیدار اختلاج میں مبتلا ہو کر داخل شفا خانہ ہوئے اور ان کے بڑے بھائی تیماردار بنے جو ایک لمحہ کے لئے الگ ہونا پسند نہ کرتے تھے اور مریض کے پلنگ سے پلنگ ملا کر لیٹتے تھے مریض کو بے خوابی کی شکایت بھی تھی، اس لئے طبی ہدایت تھی کہ کمرے میں بالکل سکون رہنا چاہئے بھائی صاحب کو بھی اس ہدایت سے پورا اتفاق تھا چنانچہ جب تک جاگتے رہتے کیا مجال کہ پیروں کی آہٹ بھی کمرے میں سنائی دے سکے کوئی بول بھی نہ سکتا تھا اشاروں سے بات چیت کرنے کا حکم تھا۔ مگر بارہ بجے کے بعد ڈاکٹر مریض کو دیکھنے آیا تو دس قدم کے فاصلہ ہی سے اس نے محسوس کیا کہ مریض کے کمرے سے کسی کے غرانے کی آواز آرہی ہے وہ آہستہ سے کواڑ کھول کر اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ بھائی صاحب قبلہ جو خاموشی اور سکوت کے سب سے بڑے حامی تھے بستر پر لیٹے ہوئے ہونٹوں کی عجیب تھرتھراہٹ سے ایسی مہیب آوازیں نکال رہے ہیں جو مریض تو مریض تندرست آدمی کو بھی جگا کر چھوڑیں، ڈاکٹر سہم گیا اس نے انہیں جگا کر کہا یاد اکثر سوتے ہیں لڑائی کرتا ہے

ہم مریض کے پاس لڑائی ڈنگا نہیں چاہتا!

اتنے میں ایک نرس دوڑتی ہوئی آئی اور اس نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا..... ڈاکٹر ڈاکٹر وارڈ نمبر ۵ کا بیمار سوتے میں غراتا ہے اسکو چپ چاپ رہنے کا انجکشن دو!

گویا خراٹے لینے والا تیماردار اور مریض دونوں ہی آفت جان ہوتے ہیں۔

بعض یورپین حضرات کو خراٹوں سے اتنی نفرت ہوتی ہے کہ وہ جب کسی اُمیدوار کو ملازم رکھتے ہیں تو اُس سے یہ ضرور پوچھ لیتے ہیں کہ تم سوتے میں غراتا تو نہیں، صاحب لوگوں کو دورے کی حالت میں بھرے اردلی کے غرانے کا بڑا تلخ تجربہ ہوتا ہے اور وہ مارے ڈر کے رات بھر کمرے میں گھومتے رہتے ہیں۔ صاحب بہادر کے ایک غرانے والے اردلی کو ہم نے دیکھا جس کے بارہ انجکشن لگائے جا چکے تھے مگر ڈاکٹر کی رپورٹ تھی کہ ابھی وہ صاحب کے پاس رہنے کے قابل نہیں، اب تک رات کو سوتے میں غراتا ہے۔ اور صاحب کو یہ گوارا نہ تھا کہ اردلی کھائے بھی اور غرائے بھی!

نائی

ہم نے جب سے ہوش سنبھالا ہے ہمیشہ یہ دعا کرتے رہتے ہیں کہ اناڑی حکیم اور اناڑی نائی سے خدا بچائے رکھے مگر کیا ضروری ہے کہ ہر دعا مقبول ہی ہو جائے چنانچہ کبھی یہ دونوں آفتیں نازل ہو جایا کرتی ہیں اور لطف یہ ہے کہ دونوں کو کافی اُجرت دے کر نقصان مول لینا پڑتا ہے اناڑی حکیم سے پالا پڑ جانے پر تو صرف اتنا ہی ہوتا ہے کہ مسہل کے بعد پیچش ہو جاتی ہے مگر اناڑی نائی بڑی بڑی مصیبتیں ڈھاتا ہے حجامت کے دوران میں شریف آدمی کے بالوں سے لے کر ناک، کان اور گردن تک پر نائی کا پورا اقتدار ہوتا ہے اور باتوں سے قطع نظر کر کے اگر وہ بقیہ چیزوں میں سے کسی چیز کو ذرا بھی چھیڑ دے تو ہر صاحب عقل سمجھ سکتا ہے کہ آدمی، آدمی نہ رہے، آخر آپ نے سُنا ہی ہو گا کہ کانپور کے ایک چابکدست نائی نے نصیب دشمنان ایک تھانہ دار صاحب کی ناک پر ہاتھ صاف کر ڈالا تھا، ظاہر ہے کہ حکیم غریب کتنا بھی اناڑی ہو، اِس قسم کی جراحی نہیں کر سکتا اِسی کا نتیجہ ہے کہ آج کل شہروں میں نائی کو نائی کہنا بھی جرم ہے جیسے درزی کو درزی کہنا سے ۶۵ سے

کچھ پہلے کی جہالت پر محمول کیا جاتا ہے اسی طرح نائی کو نائی کہہ دینا نہ اُردو محاورے کے مطابق درست نہ ہندی روزمرہ کے موافق ہم تو اس دشمن سر و بال کو نہایت انکسار کے ساتھ بھائی کہہ دیا کرتے ہیں البتہ جب کبھی کبھی یہ بھائی صاحب مشین میں بال بھر کر اُکھاڑ ڈالتے ہیں تو مُنہ سے ضرور چیخ کے ساتھ کوئی گستاخانہ کلمہ نکل جاتا ہے مگر ایسی گستاخی کو نائی کوئی اہمیت نہیں دیا کرتے بلکہ مشین کا قصور ثابت کرنے کی غرض سے اُسے بُرش سے صاف کرنا شروع کر دیتے ہیں یا ذرا سا تیل لگا دیتے ہیں اور پھر گنگنا کر اس وقت تک اپنا کام کرتے رہتے ہیں جب تک انیسویں صدی کا تیار کیا ہوا یہ جرمنی ٹینک دوبارہ اس حادثہ کا مُرتکب نہیں ہو جاتا۔ اسی جابانی بیرحمی کا اثر ہے کہ جب سُوئے اتفاق سے ہمیں آٹھ دِن میں ایک مرتبہ حجامت بنوانے کا اتفاق ہوتا ہے تو ہم مصیبت کے اس وقت کو ٹالتے رہتے ہیں، جب کوئی مفر باقی نہیں رہتا تو ادب سے سر جھکا کر اس طرح نائی کی اونچی کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں جیسے قیدی خاموشی سے جیل کی لاری میں سوار ہو جاتے ہیں لیکن قیدی اور ایک معمولی حجامت بنوانے والے میں تو بہت فرق ہے پھر قیدی جیل کی زیادتیوں کے خلاف بھوک ہڑتال کر سکتے ہیں اور ہم نائی کی مشینی حماقت کے خلاف

سر بھی نہیں ہلا سکتے، بس آہستہ سے اُف یا شی کی آواز ضرور منہ سے نکل جاتی ہے جسے نائی کبھی سُنتا ہی نہیں اور نائی کی مشین چونکہ جرمنی ساخت کی ہوتی ہے جہاں اب بڑے بڑے ٹینک بھی بننے لگے ہیں جو لڑائی کے دوران میں آدمیوں کو داب کر تیس ڈالتے ہیں، ایسی صورت میں مشین سے دو چار بال جڑ سے اکھڑ جائیں تو کاریگرانِ جرمن کے نزدیک کوئی قباحت لازم نہیں آتی خود نائی بھی بعض قرائن کی بنا پر ہٹلر کا ہم زلف سمجھا گیا ہے اِس لئے اِس کے دِل پر بھی مشین کی اِس بیدردی سے کوئی چوٹ نہیں لگتی؛

دیہات میں جہاں ہر چیز میں ابھی قدامت کا رنگ موجود ہے حجامت بنانے کے آلات بھی بالکل اِسی قسم کے ہیں جیسے حبش اور افریقہ میں لڑائی کے اسلحہ اوّل تو دیہاتی نائی کے پاس سرے سے مشین ہوتی ہی نہیں، اگر ہوتی ہے تو اتنی پرانی اور زنگ آلودہ کہ کمپنی کا نام بھی نہیں پڑھا جاتا، سفر میں انسان کو جہاں بہت سے عجیب تجربات ہوتے ہیں وہاں حجامت کے متعلق بھی نئی نئی معلومات حاصل ہوتی رہتی ہیں۔ ہمارے ایک دوست ہمارے ساتھ ریل میں سفر کر رہے تھے اور ہم دونوں کو دھول پور جانا تھا، جھانسی کے اسٹیشن پر معلوم نہیں نائیوں کی کیوں اتنی کثرت ہے کہ گاڑی رکتے ہی یہ صاحبان

اِس طرح اسٹیشن پر پھیل جاتے ہیں جیسے منیلا میں جاپانی سپاہی
اِدھر گاڑی ٹھہری اور اُدھر نائی نے مسافر کے سر اور داڑھی پر
ایک گہری نظر ڈال کر کہا۔ خط بنے گا؟

شیو ہو گا بابو جی؟

حجامت بنوا لیجئے حضور؟

لائیے ناخون کاٹ دوں!

لبیں بہت بڑھ گئی ہیں!

کم سے کم بالوں میں کنگھا تو کرا ہی لیجئے!

ہمیں تو اِن اناڑیوں کا بہت پہلے سے تجربہ تھا اِس لئے ہم نے
نائیوں کی اِس یورش پر کوئی توجہ نہ کی مگر ہمارے ساتھی ایک
موٹے تازے نائی کی منت و سماجت پر پگھل گئے۔ جب اُس نے
اپنی بڑھی ہوئی توند کو سائنس کے جھٹکوں سے اچھی طرح محفوظ
کرتے ہوئے کہا:۔

بابو جی شیو،

حجامت بابو جی؟

چٹکی بجاتے میں بنا دوں گا!

گرم پانی بھی ہے بابو جی میرے پاس!

اُسترے سب ولائتی ہیں!

خط بہت بڑھ گیا ہے بابو جی! تو انھوں نے اپنی شامت اعمال

سے خط بنوانا منظور کر لیا، نائی اپنی کسبوت سامنے کی سیٹ پر رکھ کر بابو جی کے مُنہ پر صابن لگانے میں مصروف ہو گیا پھر ایک لمبا سا اُسترا نکال کر اس نے بقول اپنے شیو بنانا شروع کر دیا ابھی بابو جی کا نصف کھیت ہی کٹا تھا کہ انجن نے کچھ سرگرمی دکھلائی۔ نائی بہت ہوشیار تھا جھٹ گاڑی سے اُتر گیا اور پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر خط بنانے لگا، بابو جی نے بڑی سختی سے ہدایت کی کہ جلد ختم کر دو۔

گاڑی چھوٹنے والی ہے! جلدی جلدی ہاتھ چلاؤ،

دیکھو جی ذرا جیتے ہاتھ سے بناؤ۔

نائی نے اپنی پوری مہارت سے کام لیا مگر اس کا کیا علاج کہ وقت کو انتظار کرنے کی عادت نہیں انجن نے سیٹی دی اور گاڑی چلدی، ہم نے پھر کر دیکھا تو بابو جی کی تھوڑی سیاہ تھی دونوں رخسار صاف ہو چکے تھے مُنہ پر کہیں کہیں صابون کے جھاگ نظر آرہے تھے اِدھر گاڑی چلی اُدھر نائی نے ہتھیلی پر جرمنی اُسترا مار کر کہنا شروع کیا، بابو جی پیسے! ذرا سی ہی کسر رہ گئی،

بابو جی، جلدی، جلدی، پیسے،

پھینک دیجئے وہیں سے، اِدھر بابو جی پکار پکار کر کہہ رہے تھے بدمعاش، لا اُسترا ہی دیدے، ابے بیٹھ جا جلدی سے گاڑی میں پلیٹ فارم پر اتنا شور تھا کہ ایک دوسرے کی بات سنتا ہی نہ تھا

پھر نائی اور بابوجی کے معاملہ میں یہ پیچیدگی تھی کہ دونوں اپنی اپنی جگہ اظہارِ غیظ و غضب کرنے میں مصروف تھے، آخر میں نوبت گالیوں تک بھی پہونچ گئی، مگر شکر ہے نہ بابوجی نے نائی کی گالی سنی نہ نائی نے اُن کی جب گاڑی اسٹیشن سے نکل چکی تو بابوجی سخت مضطرب ہوئے اور غسل خانہ میں جاکر اپنی نیم تخت گھنٹڑی کا معائنہ کیا تولیہ سے خوب رگڑ رگڑ کر مُنہ صاف کیا۔ صابن لگا کر دھویا بھی مگر تو یہ کیجئے بھلا قدرتی بال اِس طرح صاف ہو جایا کرتے تو نائی کی دُنیا میں ضرورت ہی کیا تھی، بپھرے ہوئے ہمارے پاس آئے اور کہنے لگے دیکھی آپ نے اس مردود کی ستم ظریفی، "جی نہیں"، "نہیں دیکھی کیا آنکھیں نہیں ہیں آپ کے؟

مجھے آپ کی حماقت کے دیکھنے ہی سے فرصت کب تھی کہ نائی کی ستم ظریفی پر نظر کرتا!

میں نے کیا حماقت کی؟

یہی کہ نائی کی باتوں میں آکر حجامت بنوانی شروع کردی،

میں نے تم سے پوچھ لیا تھا گاڑی کے منٹ ٹھہرے گی،

اور میں نے بتا بھی دیا تھا کہ بیس منٹ ٹھہرے گی،

اب کونسا اسٹیشن آئے گا؟

ایک چھوٹا سا اسٹیشن آئے گا جہاں آپ جیسے ایک بابوجی تو ضرور ہوں گے مگر نائی نہ ہوگا۔ "پھر میں کیا کروں؟"

خودکشی کے سوا اور کیا چارہ ہے؟

اسٹیشن پر تو نہ آئے گا کوئی ہمارے استقبال کو،

آئے گا کیوں نہیں بہت سے حضرات آئیں گے!

کوئی نائی بھی ہوگا ان میں یا سب تم جیسے سید ہے ہونگے

نائی بھی کوئی ہوا تو یقیناً بغیر اُسترے کا ہوگا۔

اچھا تو میں سیدھا چلا جاؤں گا مجھ سے اُترنے کے لئے اصرا

نہ کرنا،

ہرگز نہیں آپ ضرور چلے جایئے گا،

مگر میرے کپڑے تو تمہارے ہی بکس میں ہیں،

اور بکس ملازم کے پاس دوسرے ڈبہ میں ہے،

بھائی پھر کوئی علاج بتاؤ،

دھولپور چلکر۔ منڈوالینا اچھی طرح۔

دھولپور میں دو چار روز قیام کرنا تھا بابو جی نے پہنچتے ہی، کسی نہ کسی طرح داڑھی کی مرمت کرالی، مگر اگلے دن ہمیں بھی حجامت بنوانے کی سوجھی کافی تحقیقات کرنے پر معلوم ہوا کہ دھولپور شہر ہے اور یہاں بڑے سے بڑا نائی موجود ہے شہر کے ایک مشہور نائی کا نام بھی لیا گیا۔ ہم نے اسی کو منتخب کیا ایک گھنٹہ بعد ایک لمبا تڑنگا سیاہ فام انسان جو اپنی خصوصیات میں بہ نسبت انسانوں کے لنگوروں سے زیادہ مشابہ تھا سفید کمانی

کی عینک لگائے ہوئے وارد ہوا بغل میں سیاہ چمڑے کی نہایت پرانی کسوت تھی کندھے پر سرخ رنگ کا بہت قدیم رومال پڑا ہوا تھا۔ جو سوت کی جگہ دیکھنے میں بالوں کا بنا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ بہت دیر تک ہمیں سوچنا پڑا کہ اس آفت روزگار کے سامنے سرِ حجامت خم کیا جائے یا نہیں، لیکن جدید تمدن کی رو سے روزانہ خط بنوانا اتنا ہی ضروری تھا۔ جتنا کسی زمانہ میں مذہبی فرائض کا ادا کرنا، مجبوراً ہم نے سر جھکا دیا۔ نائی نے اپنے لمبے سیاہ اور عریاں گھٹنے کھڑے کر دئے، اور شفقت کے ساتھ ہمارا سر اُن پر رکھ کر یہ اندازہ کیا کہ حجامت کس طرز کی بنے گی۔ اِس فلسفیانہ مطالعہ کے بعد انھوں نے دیسی ساخت کا ایک بیضوی کنگھا نکال کر بال درست کئے پھر چھوٹا سا قلعی اُڑا ہوا آئینہ ہمیں دے کر کہا۔ بتاتے جائیے اسکے بعد پیتل کی لمبی سی قینچی نکال کر اس تیزی سے بال کاٹنا شروع کئے کہ تھوڑی دیر تک قینچی کے پُرکیف نغموں کے علاوہ کوئی چیز ہمارے کانوں تک پہنچی ہی نہیں، پورے نصف گھنٹہ میں بال کٹے اور اب اُسترے کا کام شروع ہوا۔ خیریت سے نائی صاحب چلم پینے کے عادی تھے، اِن کے ہاتھوں کی ہتھیلیاں دم کشی کے دھوئیں سے گہرے رونگ کی ہو گئی تھیں اور جب وہ اپنا ہاتھ ناک کے قریب لاتے تو یہ معلوم ہوتا کہ سڑا

ہوا حقّہ ہماری ناک سے لگا دیا گیا ہے اتفاق سے ہمارے محترم اور تاریخی نائی کو کھانسی بھی تھی اور جبکہ وہ اپنے فن کے جدید نکات ہی سے واقف نہ تھے تو اُن پر فلسفۂ جراثیم کی عدم واقفیت کا الزام بھی عائد نہ ہو سکتا تھا چنانچہ بے تکلف اپنی مسموم سانس وہ ہمارے مُنہ پر چھوڑ دیتے اور کبھی مصروفیت کے عالم میں کھانسی بھی آجاتی تو اِدھر اُدھر مُنہ پھیرنے کی ضرورت نہ ہوتی نہایت بے تکلفی سے بالکل ''رو بالمواجہ''، اِس کام سے فارغ ہو جاتے داڑھی بناتے بناتے ایک جگہ اُسترا پھسلا جس سے منہ پر ایک چرکا لگا نائی نے مُنہ سے ایک ٹٹکاری کی ایک آواز نکالی جیسے بیلوں کو ہانکنے کے لئے نکالی جاتی ہے اور بہت پھرتی سے تھوڑے سے بال جو اُن کے آبنوسی ٹخنہ پر لگے ہوئے تھے ہاتھ میں اٹھا کر ہمارے زخمی رخسار پر تھوپ دئیے آخر میں ناخن کٹوانے کی نوبت آئی تو نائی نے عینک سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا، اور نیچے کے ہونٹ کو دانتوں میں دبا کر بڑی احتیاط سے ناخن تراشی شروع کی لیکن پھر بھی تین انگلیاں زخمی ہو گئیں، پورے ایک گھنٹہ میں حجامت مکمل ہو سکی، مگر غنیمت ہے کہ یہ دیہاتی نائی جو ویسی استروں کو سان پر رگڑوا کر اچھی اچھی ڈاڑھیاں صاف کر دیتے ہیں اُجرت بہت کم وصول کرتے ہیں ورنہ شہر کے رام اینڈ سنس اور بشیر اینڈ کو وغیرہ تو

ایک وقت کے کھانے کی پوری قیمت جیب سے نکال لیتے ہیں اور پھر سر اور گردن کو فوجی انداز سے اِدھر اُدھر گھما کر آدمی کی ایسی توہین کرتے ہیں کہ اسے اپنے ہندوستانی ہونے کا یقین ہو جاتا ہے ذرا آپ نے آئینہ دیکھنے کی غرض سے آنکھیں اور اُٹھا کر سر کو بے ترتیب کیا اور نائی نے اپنا ایک ہاتھ آپ کی کھوپڑی پر اور ایک ہاتھ تھوڑی کے نیچے لگا کر اس انداز سے داب کر سر کو درست کر دیا کہ لازمی طور پر یہ اندیشہ پیدا ہو گیا کہ اب ذرا بھی غلطی ہوئی تو یہ گستاخ چپت لگائے بغیر نہ مانے گا، پھر ان ملتان نائیوں کے پاس مشینیں اتنی تیز ہوتی ہیں کہ ہم جیسا آدمی جو چالیس سال کی عمر پا کر بھی "عقل سلیم" کا مدعی تھا اور جواب بھی ڈاڑھی مشین ہی سے کٹوا تا ہے زخمی ہوئے بغیر نہیں بچتا۔ نائی نے مشین چلاتے چلاتے موٹر کا ہارن سن کر سڑک کی طرف نگاہ اُٹھائی جو شہر کے نائی کی خاص عادت ہے اور مشین کا پورا دندانہ کھال کے اندر گھس گیا۔ بھئی جان لوگ دُنیا میں طرح طرح کے انقلابات چاہتے ہیں مگر ہم صرف اتنا انقلاب چاہتے ہیں کہ نائیوں کو تھوڑا سا فلسفۂ جرائم پڑھا دیا جائے اور حجامت بنانے کا انھیں اسی طرح لائسنس دیا جائے جس طرح موٹر ڈرائیوروں کو دیا جاتا ہے ورنہ نائیوں کو جرمنی سے سازش کرنے کے الزام میں نظر بند کر دیا جائے کیونکہ جرمنی کے بنے ہوئے اُسترے اور مشینیں ان کے پاس بہ کثرت موجود

ہیں اور پھر "بنا مابلیڈ سس" اتنی تعداد میں مفت تقسیم کئے جائیں کہ ہ
ہندوستانی جسے حق رائے دہی حاصل ہو دِن میں دو بار حجامت بنا سکے۔

پان!

پان دُنیا کی ان چیزوں میں ہے جن کو نہ مضر کہا جا سکتا ہے نہ مفید۔ پان کو مضر تو اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ خود بیگمات جو ہر گھر میں حکومت خود اختیاری قائم کر چکی ہیں پان سے ذوق رکھتی ہیں اور اُس کو مضر کہنے یا سمجھنے کے یہ معنی ہیں کہ ہم نے روٹی اور چائے سے لے کر گھر کی ہر چیز کو نہ صرف نقصان دہ بلکہ حرام بنا لیا اور مفید اس بنا پر نہیں کہا جا سکتا کہ اسے مفید کہنے کا کوئی قرینہ ہی دستیاب نہیں ہوتا طبّی، اقتصادی، غرض ہر لحاظ سے خوب غور کرنے پر بھی اِس میں فائدہ کا کوئی پہلو دستیاب نہیں ہوتا اور ڈاکٹری نقطۂ نظر سے تو پان پائریا سے لیکر دانتوں اور مسوڑوں کی ہر چھوٹی اور بڑی بیماری کا باوا آدم ہے یہ دوسری بات ہے کہ پان نہ کھانے والے بھی اکثر اِن بیماریوں میں مبتلا نظر آتے ہیں جو پان کھانے والوں کے علاوہ کسی اور کو ہوتی ہی نہ چاہییں۔ مگر جس طرح موجودہ زمانہ میں ایک چیز کے سیاسی اقتصادی اور قومی پہلو کے علاوہ اِس کا اخلاقی پہلو بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح پان میں مفید و مضر پہلو کے ساتھ ہی ایک ادبی یا یوں کہئے کہ شاہدانہ اور عاشقانہ پہلو بھی پایا جاتا ہے۔ اُس طرف ہمارے مُلک کے اکثر بڑے بڑے شعراء نے پہلے ہی اشارہ کر دیا ہے۔ مثلاً لکھنؤ کی ایک سخنور فرماتی ہیں
مسی مالیدہ لب پر رنگ پان ہے یا مصنف زہر عشق کا ارشاد ہے!

یاد اتنی تمہیں دلاتے جائیں　　پان کل کے لئے لگاتے جائیں

حضرت غالبؔ کے دیوان میں ممکن ہے پان کا لفظ دکھائی نہ دے مگر چھالیہ کی تعریف میں جسے پان کی روح رواں کہا جا سکتا ہے وہ بھی یہ کہے بغیر نہ رہ سکے ہے

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی : زیب دیتا ہے اُسے جس قدر اچھا کہئے

علامہ تاجور نجیب آبادی جن کی جیب میں پانوں کی ڈبیہ کے علاوہ ایک بڑا سا بٹوہ بھی رہتا ہے فرماتے ہیں ہے

دیسی پان کا ذائقہ چکھو　　لو یہ گلوری مُنھ میں رکھو

بہرحال پان کا ادبی پہلو بہت شاندار ہے اور غالباً یہی وجہ ہے ہندوستان میں اسے خاطر و مدارات کی صف میں ممتاز جگہ حاصل ہے اگرچہ اب بیڑی، سگریٹ حقہ اور چائے وغیرہ نے پان کے حقوق صدارت کو کافی صدمہ پہنچایا ہے۔ پھر بھی پان اور مہمان کے درمیان وہ درجہ ضرور رکھتا ہے جو سر اسٹیفورڈ کرپس کو ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان حاصل ہے چنانچہ دیکھ لیجئے، جن مجلسوں میں سگرٹ یا چائے پان کے مقابلہ میں شرف تقدیم حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں وہاں بھی آخر میں پان کا دور ضرور ہوتا ہے اور حقہ یا چائے وغیرہ کے لوازم اتنے شاندار نہیں ہوتے جتنے پان کے ہوتے ہیں۔ چائے کا سیٹ کتنا ہی قیمتی سہی، مگر وہ چاندی کے بیش قیمت خاصدان یا ڈبے، اور پھول دار تھالی نیز بڑے اور چمکدار اُگالدان کا مقابلہ کہاں کر سکتا ہے، پھر پان کے

لازم نہیں ختم نہیں ہو جاتے بلکہ ان کا سلسلہ دراز بیگم صاحبہ کے بہت بڑے اور قیمتی پاندان نیز خود انکی تپلی تپلی حنا آلود انگلیوں تک پہنچتا ہے جن کی کوئی قیمت مقرر نہیں کی جا سکتی، حقیقتاً یہ ہے کہ پان کا سب سے بڑا ادبی اور شاعرانہ پہلو یہی ہے کہ وہ ایک مجسمۂ حُسن کی حسین تخلیق ہے جائے میں میزبان کتنا ہی اہتمام کرے اس کی تیاری اوّل سے آخر تک اِس ہندوستانی خادمہ سے متعلق ہوتی ہے جو مکھی اور چائے کی جوش دی ہوئی پتی میں کبھی فرق نہیں کرتی اور جس کا نشان انگشت اکثر چائے کی خوبصورت طشتریوں پر ثبت نظر آیا کرتا ہے برخلاف اِس کے پان کی ترکیب ہوتی ہے بیگم، خاتون یا گھر والی کی لمبی اور خوبصورت انگلیوں کی مسلسل اور مخصوص حسن آفریں آوازوں سے جنمیں چوڑیوں کا ہلکا سا ساز بھی شریک رہتا ہے۔ ذرا ان چیزوں کا اپنے گھر کی خادمہ کی جلی ہوئی ڈوئی اور قلعی اُڑے ہوئے کفگیر سے یا کنارے ٹوٹی ہوئی اُس دیگچی سے توازن کیجئے جو ہندوستان کے اکثر گھروں میں بے کار سمجھ کر چائے بنانے کی غرض سے اِس طرح مخصوص کر دی جاتی ہے جیسے گھر کا سب سے خراب اور ناکارہ لوٹا بیت الخلا کے لئے، پھر اگر یہ غریب خادمہ دائمی نزلہ یا کم سے کم باورچی خانہ کی مخصوص بیماری "اسہال" میں بھی مبتلا ہے تو اسکی چائے کسی صورت میں بھی بیگم کے پانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ پھر پان بنکے ساتھ بیڑہ

اٹھانے کی بڑی بڑی مشکل اور تاریخی مہمات بھی وابستہ ہیں جن کو کسی
طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ادبی حیثیت سے تو بیڑے کے ساتھ
اتنے رومان متعلق ہیں کہ محض اِن کو جمع کر دینے سے رومانی افسانوں
کا ایک اچھا خاصہ مجموعہ تیار ہو سکتا ہے۔ بہر حال پان سے
جدید تمدن کتنی ہی بے اعتنائی برتے حسن وجمال کی روایات
ہمیشہ اِس سے وابستہ رہیں گی اور بیڑے کی سُرخی براہ راست
نہیں تو "لپ اسک کی شکل ہی میں لب شکر خا پر نمایاں ہوتی رہے گی
ہندوستان کی مجالس خلوص میں پان کا خاص درجہ ہے مگر عہد
موجودہ میں جہاں گھی میں مونگ پھلی کا تیل اور دودھ میں پانی شامل
کرنا عملاً کوئی جرم نہیں رہا۔ پان کے معاملہ میں بھی اکثر قسم کی صنعتیں
ردار کھی جانے لگی ہیں، بعض اوقات تھالی میں اوپر دیسی پان رکھ
دیئے جاتے ہیں اور نیچے مدراسی، بنگلہ یا کسی اور قسم کے خراب
پان ہوتے ہیں چونکہ ہندوستان میں خاطر تواضع کا سلسلہ عموماً
بڑے آدمیوں سے شروع ہوتا ہے۔ اِس لئے وہ دیسی پان تو جا کر
میں بڑے آدمیوں کے حصہ میں اور مدراسی یا بنگلہ پان غریبوں
کے لئے رہ جاتے ہیں۔ اگرچہ حقہ کے معاملہ میں بھی اِس قسم
کی بے تمیزیاں جاری ہیں اور ہم نے ایک بار خود غلط میزبان
کے یہاں دیکھا ہے کہ جب وہ خود حقہ پیتے تو جیب سے چاندی
کی منہ نال نکال کر نے میں لگا لیتے، جب دوسروں کی طرف

بڑھاتے تو مُنہ نال نکال لیتے گویا ان کے علاوہ تمام ارباب مجلس یا تو پائیریا، دق یا کسی اور متعدی قسم کی بیماری کا شکار ہیں جن کا جھوٹا کیا ہوا حقہ طبّی اصولوں سے مضر صحت ہے یا کم سے کم وہ اتنے گندہ دہن ہیں کہ اُن کے مُنہ سے لگا ہوا حقّہ میزبان ایسا پاکیزہ نفس انسان نہیں پی سکتا ہمارے سامنے یہ بیہودگی کی گئی تو ہم نے ایک موقعہ پر مہمانوں کو حقہ پیش کرنے کی جگہ صرف "چلم" حقہ سے اتار کر پیش کردی اور صاف کہہ دیا کہ آپ صاحبان اسی کے مستحق ہیں، حقہ بیماریوں کے جراثیم سے آلودہ نہیں کیا جاسکتا لیکن پانوں کے اس فریب میں ہم ابھی تک صرف اتنا ہی کر سکے ہیں کہ اور بڑے آدمیوں کی طرح ہم بھی اوپر ہی سے کھانا شروع کر دیتے ہیں۔ یا اگر دیسی پان ختم ہو جاتے ہیں تو زور سے کہہ دیتے ہیں کہ دیسی پان اب نہیں رہے، اگر آپ صاحبان مدراسی پان پسند کریں تو حاضر ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان تلخ حقائق سے میزبانوں کی بڑی توہین ہوتی ہے اس لئے کہ اکثر لوگ اب اس طرز عمل کو ترک کر چکے ہیں مگر اس کا کیا علاج کہ اکثر بیگمات کو اپنے شوہروں سے عشق کی حد تک محبت ہوتی ہے اور اپنی دوسری ملکی بہنوں کے شوہروں کو وہ سوتیلا بھائی سمجھتی ہیں اس بنا پر پانوں کی ڈبیہ میں سب سے نیچے دو تین عمدہ قسم کے دیسی پان رکھ دیئے جاتے ہیں جن میں الائچی کے دانے اور لکھنؤ کا بنا ہوا بہترین

قوام بھی ہوتا ہے۔ اور اوپر وہی نبگلہ یا مدراسی پان ہوتے ہیں۔
اب ہر مہمان ہماری طرح محقق طوسی کا ہم پایہ تو ہوتا نہیں
کہ پہلے ڈبہ کو اچھّی طرح اُلٹ پلٹ کر دیکھ لے پھر پان کھائے
مگر واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کی کم ظرفیاں پانوں کی مقبولیت
اور ہر دلعزیزی پر بہت بُرا اثر ڈالتی ہیں، بعض لوگوں نے محض
اِسی وجہ سے پان کھانا چھوڑ دیئے کہ اِن کے ساتھ بلایا اور سنگاپور
والی بدیسی ذہنیت کا مظاہرہ کیا گیا تھا۔ ایک جلسہ میں میزبان
نے نہایت نزاکت اور محبّت کے ساتھ ہماری طرف پانوں کی ڈبیہ
بڑھاتے ہوئے کہا۔

پان حاضر ہیں!
کھائیے!

واللہ حضرت نوش فرمائیے!

ہم نے ڈبیہ ہاتھ میں لے کر بالکل اِس طرح اس کی تلاشی
لی جیسے جعلی نوٹوں کے شبہ میں پولیس کے افسران دفتر کے
دفتر چھان مارتے ہیں لیکن دیسی پان ہاتھ نہ آنے تھے نہ آئے
میزبان کی وضع قطع بتا رہی تھی کہ اُن کی ڈبیہ طلسم ہوشربا
سے کم نہ ہوگی، وہ کنکھیوں سے ہمیں دیکھ رہے تھے، ایک
دفعہ ہم نے سارے پان معہ اُس سُرخ کپڑے کے ایک
ہاتھ میں اُٹھائے جس میں پان لپٹے ہوئے تھے۔ اِس کپڑے

کے نیچے کیا دیکھتے ہیں کہ آلہ اودل کے وطن عزیز یعنی مہوبے کے نہایت اعلیٰ قسم کے پان بیڑوں کی شکل میں لپٹے ہوئے رکھے ہیں۔ میزبان شرمندہ تو بہت ہوئے پھر بھی یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ حضرت اوپر ہی سے کھا لیجئے۔

کیوں!

یہ پان میرے لئے رکھ دیئے جاتے ہیں بات یہ ہے کہ مجھے مُنہ کی کچھ بیماریاں ہیں!

مشکل یہ ہے میں بھی اپنی بیوی کی رائے میں اِس قسم کی بیماریوں کا شکار ہوں ہم نے کہا اور ڈبیہ دوسرے مہمانوں کے طرف بڑھاتے ہوئے بلند آواز سے بولے جو صاحب مُنہ کی بیماریوں سے ڈرتے ہوں وہ نیچے والے دیسی پان کھائیں!

بعض میزبان اتنے کفایت شعار ہوتے ہیں کہ بغیر مطالبہ کئے پان منگاتے ہی نہیں، ہمارے دوستوں میں ایک صاحب اسی قسم کے تھے۔ جب ہم اُن کے یہاں جاتے گھنٹہ دو گھنٹہ کے بعد خود ہی یاد آجاتا تو پان کا مطالبہ کر بیٹھتے انھیں خیال تک نہ ہوتا کہ مہمانوں کو کم سے کم پان ہی پیش کر دیئے جائیں۔ حضرت موصوف اِس قدر تھے مولوی قسم کے آدمی اور دو چار طالبعلم ہر وقت اُن کے یہاں موجود رہتے تھے۔ ہم نے ایک ذہین طالب علم کو میزبان کی عدم موجودگی میں اچھی طرح سمجھا دیا کہ مولوی صاحب تم سے کہیں

یا نہ کہیں تم بغیر مانگے ہر نصف گھنٹے کے بعد گھر میں سے پان لاتے رہنا۔ لڑکے نے یہی کیا۔ مولوی صاحب آکر مسند درس پر رونق افروز ہوگئے اور لڑکے نے پان لانا شروع کر دیئے۔ جب ہر بیس۲ بچیس۵ منٹ کے بعد مولوی صاحب نے اپنے لائق شاگرد کی یہ فیاضی دیکھی تو ایک مرتبہ ذرا ٹیکھی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر فوراً گھر میں پہنچکر جواب طلب کیا۔

یہ آج بغیر مانگے پان کیوں بھیجے جارہے ہیں بار بار!

بغیر مانگے کیوں بھیجتی کیا پاگل ہوگئی تھی میں!

میں نے تو ایک مرتبہ بھی نہیں مانگے!

مجھ سے تو ہر مرتبہ آکر کہا اس بدذات نے کہ مولوی صاحب پان منگا رہے ہیں جلدی بنا دیجئے!

اچھا یہ بات ہے!

ہاں بالکل یہی!

مولوی صاحب غصہ میں بھرے ہوئے باہر آئے اور آتے ہی لڑکے سے کہا سبق سُنا!

اُس غریب نے فرفر سُنا دیا اور کسی جگہ مولوی صاحب کو اپنی بھڑاس نکالنے کا موقعہ نہ لگا۔ پھر فرمایا آموختہ سُناؤ۔ ایک جگہ آموختہ میں کچھ کسر تھی۔ مولوی صاحب نے بے تحاشا مارنا شروع کیا۔ ہمیں رحم آیا اور ہم نے مولوی صاحب کی کھجور کی قمچی

کو مضبوط پکڑتے ہوئے کہا۔ مولوی صاحب رہنے دیجئے!
کیوں نہ رہنے دیجئے بڑا مردود ہے یہ!
مولوی صاحب اِس کا کچھ قصور نہیں ہمنے منگائے تھے!
"کیسے پان؟"
وہی جن پر آپ اِس غریب کو مار رہے ہیں!
عورتیں زیادہ پان کھانے والے مہمانوں سے اِس طرح سے انتقام لیتی ہیں کہ جب باہر سے پانوں کی مانگ زیادہ ہوتی ہے تو دو چار پانوں میں چونہ زیادہ لگا دیتی ہیں۔ مگر ایسے پانوں پر کوئی نشان تو ہوتا نہیں، اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ اِن بارودی پانوں میں سے کوئی پان خود میزبان ہی کے حصہ میں آجاتا ہے اور وہ اُسے کھا کر جب مجروح منہ کو لے کر گھر میں جاتے ہیں اور اتفاق سے اِس دِن سالن میں مرچیں بھی کچھ زیادہ ہوتی ہیں یا ویسے ہی چونہ کے زخم میں زیادہ معلوم ہوتی ہیں تو وہ بار بار بگڑ کر کہتے ہیں۔
یہ سالن میں آج مرچیں کیوں بھر دیگئیں اتنی؟
مرچیں تو زیادہ نہیں ہیں!
ہیں کیسے نہیں ذرا کھا کر دیکھئے!
میں دیکھ چکی ہوں، شاید بھوک نہیں آپ کو اس وقت نہ کھانے کے سو بھانے، مرچوں ہی پہ کیا موقوف ہے۔

بھوک کیوں نہ ہوتی!

پھر مرچیں تو زیادہ نہیں ہیں آپ کی جان کی قسم کھا کر کہتی ہوں..... ارے کہیں منہ تو نہیں کٹ گیا آپ کا چونے سے!

ہاں مُنہ بھی کٹ گیا ہے آج!

تو کیا دیکھکر نہیں کھایا کرتے آپ پانوں کو!

دیکھنے کی کیا ضرورت ہے، جیسے یہاں سے جاتے ہیں کھا لیتا ہوں۔

یہاں سے تو مہمانوں کے لئے ہر قسم کے پان جاتے ہیں بعض میں دانستہ چونا زیادہ لگا دیا جاتا ہے۔

پانوں کا عورتوں سے قریبی تعلق ہے اس لئے عورتوں کی تہذیب اور ان کی سلیقہ شعاری کا ثبوت اکثر پانوں سے مل جاتا ہے بعض خواتین بوتل سے لالٹین میں تیل بھرنے کے بعد بغیر ہاتھ دھوئے پان بنا دیتی ہیں اور پانوں سے مٹی کے تیل کی بو آنے لگتی ہے، بعض مصالحہ پیسنے یا پیاز کاٹنے کے بعد بددلی کے ساتھ پان لگا دیتی ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پانوں میں ہلدی مرچ کا ذائقہ آجاتا ہے ایک صاحب کے گھر میں سے پان آئے، اُن کے کھاتے ہی ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے پانوں میں "آیوڈوفارم" لگا دیا ہے۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا "اُنکی" اُنگلی میں زخم ہے جس پر کسی، انگریزی دوائی کی پٹی بندھی ہوئی ہے۔

سواری

سواری کے معنی کا تعین بہت دشوار ہے۔ بظاہر ریل، موٹر، ٹانگہ، گاڑی گھوڑے اور سائیکل کو سواری کہنا بغیر کسی سند کے جائز ہو سکتا ہے۔ لیکن بعض اہل زبان ہر اس مرد اور عورت کو جو ریل، موٹر تانگہ یا گاڑی وغیرہ پر سوار ہو یا سوار ہونے کا ارادہ رکھتا ہو سواری کہتے ہیں اور مردانہ سواری یا زنانہ سواری کہکر صنف لطیف اور قوی میں فرق کر دیتے ہیں۔ بعض ایسے شرفا جو اُردوئے معلیٰ کو اپنے گھر کی پیداوار سمجھتے ہیں سواری کا لفظ صرف عورتوں کے معنی میں استعمال کرتے ہیں اور اصل بات یہ ہے کہ سواری کا لفظ عرفِ عام میں "عورت" ہی کے لئے مخصوص ہو کر رہ گیا ہے۔

ایک دن ہمارے دو بے تکلف دوست بمبئی سے تشریف لے آئے۔ دونوں غریب "منشی فاضل" کا امتحان دے کر لاہور سے آرہے تھے، تیسرے دِن اُن منشی فاضل دوستوں نے جانیکا اصرار کیا جہاں سے روانگی ہونے والی تھی وہاں ریلوے اسٹیشن نہ تھا۔ سفر کا ذریعہ صرف موٹر لاری تھی، اور وہ بھی چوبیس گھنٹہ میں صرف ایک مرتبہ چلتی اور ہر وقت کھڑی رہتی تھی۔ ہمارے دوستوں نے مقاصد روانگی کی اہمیت سے ہمیں متاثر

کرتے ہوئے نہایت اضطراب کے ساتھ کہا آج ہمارا چلا جانا بہت ضروری ہے۔ پرسوں بمبئی پہنچنا ہے، ہم نے موٹر ڈرائیور کو بلا کر کہدیا بھائی دو سواریاں ہمارے یہاں سے جائیں گی۔ جگہ خالی رکھنا، وہ بہت اچھا کہہ کر چلا گیا، اور ہمارے دونوں دوست جو عربی، فارسی نیز انگریزی اور ترکی بلکہ ہندی اور سنسکرت کے قواعد کی رو سے قطعی "مذکر" تھے جلدی جلدی سامان سفر درست کرنے لگے جب تیار ہو کر باہر آئے تو موٹر کی روانگی میں تھوڑی سی دیر تھی۔ ٹھیک ۹ بجے ڈرائیور صاحب تشریف لائے اور فرمانے لگے۔ پردہ کے لئے کپڑا منگوا دیجئے۔

"پردہ کی کیا ضرورت ہے؟" ہم نے استعجاب کے ساتھ پوچھا۔

"آپ نے ابھی فرمایا تھا سواریاں جا رہی ہیں۔ میں نے زنانہ حصہ میں دو نشستیں روک لی ہیں۔ اگر برقعہ ہو تو واقعی پردہ کی ضرورت نہیں، گرمی کا وقت ہے پردہ سے اور ہوا رک جائے گی۔"

ہم نے کہا "آپ مطمئن رہیں۔ ہمارے یہاں کی سواریاں ذرا کالج دیدہ ہیں بے پردہ ہی سوار ہوں گی۔"

ہمارے دوست متحیر تھے یہ معمہ کیا ہے۔ جب یہ حضرات موٹر میں سوار ہونے لگے تو ڈرائیور نے مسکرا کر سوال کیا۔ سواریاں

بیٹھ گئیں؟
یا تو یہ سمجھئے کہ ڈرائیور صاحب کے خیال میں "سواری" عورت کے علاوہ کسی اور چیز کو کہہ ہی نہ سکتے تھے یا پھر یوں سمجھئے کہ ہمارے اِس کہنے سے کہ سواریاں جائیں گی اُنھوں نے یہ سمجھا کہ عورتیں جائیں گی، مگر سواریاں جائیں گے کہنا کسی اصول سے بھی جائز نہ تھا یہ اصطلاح تو ریلوے میں بھی رائج نہیں جہاں اُردو کو نہایت صحیح بولنے اور لکھنے پر کافی زور دیا جاتا ہے بہر حال یہ سواری ہے بہت عجیب مخلوق اور اُس کی تذکیر و تانیث کے سلسلہ میں بس اکبر الہ آبادی کی اِس رائے کو ہی حکم بنایا جا سکتا ہے۔

مذکر کے لئے "ہی" ہے مونث کے لئے "شی" ہے مگر حضرت
مخنث ہیں یہ "ہیوں" میں نہ "شیوں" میں۔

اگر سواری "عورت ہی کو کہا جائے تو بھی یہ ماننا پڑے گا کہ یہ عجیب مخلوق ہے، جب تک گھر میں رہتی ہیں "بارِ زوج" ثابت ہوتی ہے اور جب دُنیا کی کسی متحرک یا غیر متحرک سواری کے ذریعہ سے منتقل ہوئی یا منتقل کی جاتی ہے تو باردوش بن جاتی ہے چنانچہ جب گھر سے برقعہ پہن کر یا اوڑھ کر نکلی ہے تو ذرا مُنھ پھیر لینا! ——— بھائی مُنھ پھیر لو سواریاں بیٹھ رہی ہیں کا نعرہ لگتا ہے۔ اور یہ نعرہ لگانے والے نقیب جناب

شوہر ہی ہوتے ہیں اور جب اِس شان سے موٹر، یا ریل یا اور کسی سواری میں جلوہ فرما ہو جاتی ہے تو "شوہر" کی حیثیت ہی بدل جاتی ہے اور وہ صرف ایک "خادم" بن کر رہ جاتا ہے۔ کبھی حکم ملتا ہے۔

"پانی پئیں گے! کبھی کہا جاتا ہے گرمی لگتی ہے، ذرا پردہ اٹھا دیجئے"۔

اِس کے بعد دورانِ سفر میں ہزاروں قسم کے جا و بیجا احکام صادر ہوتے رہتے ہیں۔

"ارے دیکھنا ذرا اِس ندی میں سے ایک لوٹا پانی تو بھر لائیے"!

"وہ دیکھئے آم لگے ہیں، باغ والوں سے پوچھئے تو سہی بیچتے ہیں؟"

"ارے میرا جوتہ گر گیا کہیں، ذرا دوڑیئے کہیں کوئی اُٹھا نہ لے"!

ریل کی سواری تو ذرا مہذب اور بے مروّت قسم کی سواری ہے اِس میں اتنی فرمائشوں کا موقعہ نہیں ملتا پھر بھی اسٹیشنوں پر متھرا کے پیڑے اور ہاپور کے پاپڑ غازی آباد کی جلیبی اور فرید آباد کی مہندی تو ضرور خرید نا پڑتی ہے۔

ریل کے سفر میں دو تین یا چار پانچ سواریاں جمع ہو جاتی ہیں تو جو معصوم ان کی حفاظت پر مامور ہوتا ہے اس کا ایک عذاب میں مبتلا ہو جانا یقینی ہے۔ سامان تو اسٹیشنوں پر قلیوں

سے اُٹھوا لیا جاتا ہے مگر اِن سواریوں کے اُٹھانے کا کوئی ذریعہ اِس وقت تک پلیٹ فارموں پر موجود نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب قلی سامان سر پر رکھ کر پورب کی طرف چل دیتا ہے تو سواریوں کا محافظ لوٹا اور پاندان ہاتھ میں لے کر یا کسی چھوٹے سے بچے کو بغل میں دبا کر یا کسی بڑے بچے کی انگلی پکڑ کر جلدی خلدی چلی آؤ کہتا ہوا قلی کے پیچھے بھاگنے لگتا ہے تو سواریوں میں سے کوئی سواری یا تو دکھن کی طرف چل دیتی ہے اور پھر "ہائے مر گئی!" کہہ کر پلیٹ فارم پر بیٹھ جاتی ہے اور "سروتے" سے اپنی نازک زیر پائی کی کیلیں ٹھونکنے لگتی ہے"

ادھر قلی اور محافظ میں ایک عجیب کشمکش پیدا ہو جاتی ہے قلی کا منشا ہوتا ہے کہ بھاری سامان کسی طرح جلدی سے منزل مقصود تک پہنچا دے، اور محافظ صاحب کی آرزو ہوتی ہے کہ وہ ایک ہی جست میں قلی کا نمبر بھی، دیکھ لیں اور پلیٹ فارم پر میٹھی ہوئی "سواری" کو بھی کوئی موثر امداد پہنچا دیں، چنانچہ ایک طرف وہ قلی کو آواز دے کر کہتے ہیں۔

"ٹھہرو بھائی ذرا آنے تو دو، دوسری طرف پیچھے مڑ کر سواریوں سے خطاب کر کے کہتے ہیں،

"آئیے ذرا قدم اُٹھا کر آئیے!!"

"اور آپ یہاں بیٹھی ہوئی کیا کر رہی ہیں؟"

"دیکھئے وہ قلی کہاں پہنچ گیا اُٹھئے جلدی اُٹھئے نا!"

ریل میں سواریوں کی حفاظت کا کام جس تندھی کے ساتھ ہمارے ملک کا دیہاتی کرتا ہے شاید حبش کا غلام بھی نہیں کر سکتا ہمارے ایک دیہاتی دوست دہلی سے آگے کہیں جارہے تھے اور اتفاق سے بہت سی سواریاں ان کے ساتھ تھیں۔ ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر اُترنا تھا۔ گاڑی غازی آباد سے چلی تو انھوں نے زنانہ ڈبّے کے قریب تر جا کر سواریوں سے کہا "یہاں سے تیسرے اسٹیشن پر اتر جائیے گا۔ میرا انتظار نہ کیجئے گا۔ سامان زیادہ ہے میں اسے دیکھوں گا۔"

"اکیلے نہیں اتریں گے ہم" ایک سواری نے کہا۔

"کیوں نہیں اُتریں گی آپ؟"

ڈر لگتا ہے ہمیں۔ جب تک آپ نہ آئیں گے ہم نہیں اتر سکتے!

اسٹیشن پر کھڑی ہوئی ریل سے اترنا کیا کوئی مشکل کام ہے آپ کے نزدیک یہ تو وہ زمانہ ہے کہ عورتیں چلتے ہوئے ہوائی جہاز سے چھتری کے ذریعہ زمین پر اُتر آتی ہیں۔ دیہاتی دوست نے جلدی جلدی کہا۔

"عورتیں نہ ہوں گی وہ بلائیں ہوں گی ہم تنہا ہرگز نہ اتریں گے!

بڑی مشکل سے دوسری سواریوں کے کہنے سے اس شوخ سواری نے وعدہ کیا کہ بہت مناسب تیسرے اسٹیشن پر اتر جائیں گے

گاڑی چلی اور بدقسمتی سے تیسرے اسٹیشن تک پہنچتے پہنچتے ایک ایسی جگہ بھی دو تین منٹ کے لئے ٹھہر گئی جہاں لائن پر کچھ کام ہو رہا تھا۔ عورتوں نے ریل کے اِس قیام بیجا" کو بھی اسٹیشنوں میں شمار کر لیا اور اِس طرح دوسرے ہی اسٹیشن پر نہایت تیزی سے سواریوں کا نزول اجلال شروع ہو گیا۔ اتفاق سے دیہاتی دوست نے اپنی حسب عادت جھانک کر دیکھا اور یہ دیکھتے ہی ان کے حواس خراب ہو گئے کہ دو سواریاں اُتر چکی ہیں۔ باقی اُترنے کے لئے تیار ہیں۔ اُنھوں نے چلاّ کر کہا۔

کیا غضب کر رہی ہو، اگلے اسٹیشن پر، بیٹھو جلدی بیٹھو، گاڑی چلی، جلدی، جلدی!

اگرچہ اِن سب کی رائے میں ہمارے دیہاتی دوست غلطی پر تھے۔ کیونکہ سواریاں انکی ہدایت کے موافق تیسرے اسٹیشن پر ہی اتر رہی تھیں مگر خوش قسمتی سے اِس موقع پر ان کی تنبیہہ سے کسی نے اختلاف نہیں کیا اور جلدی جلدی یہ برقعہ پوش لاشیں ریل میں بیٹھنے لگیں۔ مگر ایک غریب جو ذرا اپنے موٹاپے کی سے مجبور تھیں رہ گئیں اور گاڑی چھوٹ گئی۔ اِدھر گاڑی چلی، اُدھر وہ اپنے ڈبہ کی طرف دوڑیں۔ دیہاتی دوست نے پھر چلا کر کہا۔

"بیٹھ جاؤ وہیں بیٹھ جاؤ بھاگو مت، وہیں بیٹھ جاؤ؟"

چنانچہ اُنھوں نے اپنی فطری اطاعت شعاری سے کام لیا اور برقعہ سنبھال کر وہیں یعنی زمین پر تشریف فرما ہو گئیں۔
وہ پھر چیخے "ارے جلدی کرو، جلدی اٹھو، دوڑو، دوڑو!"
وہ پھر ڈبہ کی طرف دوڑیں، دیہاتی دوست پھر مضطرب ہو کے چلائے۔
"بھائی وہیں بیٹھ جاؤ! دوڑتی کیوں ہو؟"
انھوں نے پھر تعمیل ارشاد کی۔ اب ہر طرف سے قہقہوں اور تالیوں کی آوازیں سنائی دیں۔ آخر کسی عقلمند کے مشورے سے زنجیر کھینچی گئی اور انھیں قریب کے مردانہ ڈبہ میں سوار کرایا گیا۔ اُنھوں نے ہانپتے ہوئے کہا:۔
توبہ توبہ، ہم نے پہلے ہی کہا تھا کہ ہم اکیلے نہیں اتریں گے!
ایک دِن چند سواریوں نے مِل کر ایک جمہوریت بنائی جس کی صدارت ہمارے انہی دیہاتی دوست کی اہلیہ محترمہ کے حصّہ میں آئی تھی۔ کیونکہ نصیب دشمناں وہ کچھ پڑھی لکھی بھی تھیں، اتفاق رائے سے طے ہوا کہ آج گاڑی کا انتظام کر کے کہیں چلنا چاہیے چنانچہ گاڑی آئی اور ایک وقت کا رزق یعنی کھانا لے کر یہ پوری جمہوریت اِس میں بڑے شوق سے سوار ہو گئی۔ چلتے وقت ہمارے معصوم اور دیہاتی دوست نے عرض کیا۔ ایک بیل ذرا شریر ہے کہیں گاڑی لے کر بھاگ نہ جائے سمجھیں!

صدر جمہوریہ نے بگڑ کر کہا:۔
آپ نہ بولئے آپ کا تو منشا ہی یہی ہے کہ ہم گھر سے باہر قدم نہ رکھیں۔ آج ذرا درگاہ جانے کا ارادہ کیا تو بیل شریر ہو گیا آج تک تو شریر نہ تھا بیل میں پوچھتی ہوں ایسے بیل رکھنے کی کیا ضرورت ہے جو شریر ہوں میری رائے میں آپ بیل سے بھی زیادہ شریر ہیں کہ جو اس قسم کے بیل خریدتے ہیں۔
بہر حال یوگوسلاویہ کی یہ پوری جمہوریت گاڑی میں سوار ہو گئی تھوڑی دور چلنے کے بعد وہ "ذی حیوانِ مطلق" جسے خالص اُردو میں بیل کہتے ہیں کہ دوسری سواری یعنی موٹر کو دیکھ کر بھڑک گیا۔ گاڑیبان غریب نے لاکھ کوشش کی کہ بیل قابو میں آجائے اور بقول شخصے کوئی ناگوار حادثہ واقع نہ ہو۔ مگر تجربہ سے یہ ثابت ہوا ہے کہ ناگوار حادثہ جب ہونے والا ہوتا ہے تو ہو کر ہی رہتا ہے۔ چنانچہ ایک چبوترے پر گاڑی کا پہیہ چڑھا اور گاڑی اُلٹ گئی، یعنی صحیح معنوں میں انقلاب ہو گیا، سواریاں بڑی بے ترتیبی سے ادھر اُدھر جا پڑیں کسی کے ہاتھ میں موچ آئی ہے۔ کسی کے پیر میں، برقعے بدحواسی میں الگ جا گرے دیکھنے والے پردہ کے احترام میں کوئی ہمدردی نہ کر سکے اور انھیں اپنی قوتِ عمل ہی پر بھروسہ کرنا پڑا!
جو اس درست ہونے پر سب سے پہلے ہمارے دوست

کی گرفتاری کا وارنٹ جاری ہوا، وہ دوڑتے ہوئے آئے اور گھبراہٹ میں جلدی جلدی پوچھنے لگے، خیریت تو ہے؟

سب اچھے ہیں؟

"کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟"

"کپڑے تو نہیں پھٹے؟"

"کسی نے دیکھا تو نہیں؟"

بھائی میں یہ پوچھتا ہوں کسی کی نظر تو نہیں پڑی؟

"اور پاندان تو نہیں الٹا؟"

حالانکہ پاندان گاڑی میں تھا۔ جب گاڑی ہی الٹ گئی تھی تو پاندان کے الٹ جانے میں اب کیا شک ہو سکتا تھا،

اُدھر سے کچھ تامل کے بعد جواب ملا۔

"چوٹ کیوں نہ لگتی"

"کپڑے کیوں نہ پھٹتے"

"سب ہی کچھ ہوا، وہ تو بندوبست ہی ایسا کیا گیا تھا تا؟"

"پہلے ہی کہہ دیا گیا تھا کہ بیل شریر ہے"

"میں خوب جانتی ہوں یہ ساری شرارت آپ کی ہے بیل کی نہیں ہے؟"

اس واقعہ کے بعد جسے اخباری زبان میں یقیناً حادثہ فاجعہ کہہ سکتے ہیں ہمارے دوست نے جہاں اِس کا تذکرہ کیا "سواری"

کا لفظ ضرور استعمال کیا مگر لطف یہ تھا کہ وہ گاڑی کو بھی سواری کہہ رہے تھے اور بیوی کو بھی، اس وقت ہمیں لفظ "سواری" کی تحقیق کا خیال پیدا ہوا، غالباً سواری کی "ی" کو بعض لوگ یائے نسبتی سمجھتے ہیں۔ اور بعض یائے تانیث اور بعض کفایت شعار حضرات اس سے دونوں کام لیتے ہیں یعنی نسبت کا بھی اور تانیث کا بھی معلوم نہیں اصل حقیقت کیا ہے؟

چوراہہ

ہندوستان کے جو مقامات یورپ کے قہوہ خانوں کا کامیابی سے مقابلہ کر سکتے ہیں ان میں چوراہہ، چوپال، اور الاؤ کو خاص اہمیت حاصل ہے، چوپال اور الاؤ کو ذاتی ملکیت کہا جا سکتا ہے مگر "چوراہہ" عوام سے براہ راست تعلق رکھنے کی بنا پر ہندوستان میں نہایت عجیب جگہ ہے۔ چوراہہ کے اجتماعوں کا کسی ایک شخص پر بار نہیں پڑتا اور نہ یہاں بیٹھنے کی کوئی فیس مقرر ہے۔ اس چوراہہ پر ہر معیار اور ہر خیال کا آدمی پوری آزادی سے شریک جلسہ ہو کر بحث و مباحثہ میں حصہ لے سکتا ہے اور یہی وہ لطیف خصوصیت ہے۔ ہندوستانی چوراہوں، کی جو اُسے یورپ کے قہوہ خانوں سے بہت بلند کرتی ہے۔

قہوہ خانوں میں جانے کے لئے اچھی خاصی رقم جیب میں

ہونی چاہیئے۔ اس اعتبار سے قہوہ خانوں میں بہت حد تک معیاری قسم کے لوگ جمع ہوتے ہیں جن کے اظہار خیال میں بہت نہیں تو تھوڑی ہی متانت اور عقل کو ضرور دخل ہوتا ہے مگر چوراہے پر بولنے والا انسان جسے ذرا سی ترمیم کے ساتھ حیوان بنایا جاسکتا ہے اپنی گفتگو میں عقل سلیم کے کم سے کم جزو کو بھی صرف کرنے کی زحمت گوارہ نہیں کرتا۔

شام کو دن چھپنے کے بعد دن بھر کے تھکے ہارے اہل محلہ جن کے گھروں میں مخلسی زندگی کا لطف میسر نہیں آسکتا، ننگے سر، پاؤں میں سلیپر پہنے ہوئے چوراہہ کے کسی پتھر، چبوترے یا سڑک کے کنارے کسی بلندی پر آبیٹھتے ہیں اور بیڑی سگرٹ یا پانوں کا مشغلہ شروع ہوجاتا ہے۔ ہر شخص اپنا مہمان، میزبان اور ترجمان خود ہوتا ہے، آہستہ آہستہ چوراہے کی تمام نشستیں پر ہوجاتی ہیں اور کسی نہ کسی عنوان پر گفتگو شروع ہوجاتی ہے، پھر دیکھئے آدم کے یہ چہیتے بیٹے کیسی کیسی گلفشانیاں کرتے ہیں دنیا کا کوئی انتظام، محکمہ کا کوئی ردوبدل، ملکی وقومی انتظامات کا کوئی شعبہ ایسا نہیں رہتا جس پر تھوڑی بہت بخشش نہ ہوجائے۔ افسران کی رشوتوں پر روشنی ڈالی جائے گی عدالتوں کی بے ضابطگیوں پر برا بھلا کہا جائے گا بیکار سے کے واقعات بیان ہونگے، بدچلنی اور چوری کی واردات پر رائے زنی ہوگی

سیاسی جماعتوں کے کارکنوں کی دیانت زیر بحث آئیگی مقررین کی تقریروں پر تبصرے ہونگے۔ بتا دلوں پر اعتراضات کئے جائیں گے جنگ اور واقعاتِ جنگ پر اظہار خیال ہوگا، اور فتح و شکست کے متعلق پیشین گوئیاں کی جائیں گی۔ غرض رات کی خاموشی اور تاریکی میں نغمہ سرائی کرنیوالے یہ سپوت سب ہی کچھ کر ینگے بحث کا انداز اگرچہ ہمیشہ دوستانہ ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی حریفانہ بھی ہوجاتا ہے مگر چوراہے کی لڑائی کا فیصلہ بہر حال چوراہے ہی پر ہوا کرتا ہے۔ چوراہہ کے مباحثوں کا کوئی موضوع مقرر نہیں ہوتا اور اجلاس بغیر انتخاب صدر ہی کے شروع ہوجاتا ہے، ایک صاحب کچھ کہہ دیتے ہیں اس پر دوسرے صاحب اپنی ناچیز رائے کا فوراً اظہار فرما دیتے ہیں اور جلسہ شروع ہوجاتا ہے، بالعموم، پیرایۂ آغاز یہ ہوتا ہے:

اور بھی کچھ سنا آپنے! ایک صاحب چابیوں کے چھلّے کو انگلی میں چکر دیتے ہوئے بولے۔

کہئے کوئی نئی بات ہے کیا؟

ہاں بالکل نئی، آج صبح ایک لاری سائیکل سے ٹکرا گئی!

لاری ٹکرا گئی، سائیکل سے یا سائیکل لاری سے اور سائیکل کو زیادہ نقصان پہنچا یا لاری کو۔

ذرا سنتے تو آپ تو بولنے ہی نہیں دیتے سائیکل پر ایک...

دوسرے صاحب فوراً بول اُٹھے آدمی سوار تھا! ارے تو بہ وہ

تو پس ہی گیا ہو گا۔

بھائی مجھے پوری بات تو کہنے دو، ہاں میں کہہ رہا تھا کہ

سائیکل پر ایک نرس سوار تھی......

لاحول ولا قوۃ میں سمجھا آدمی تھا، اچھا پھر..........

تو اب نرسیں بھی سائیکلوں پر پھرنے لگیں۔

اتنے میں کوئی اور صاحب بول اُٹھے خیر ایسے واقعات

تو شہر میں ہوتے ہی رہتے ہیں۔

اور وہ قتل کے مقدمہ کا فیصلہ بھی سُن لیا آپنے حاضرین میں

سے ایک اور صاحب زبان بولے۔

کیا ہوا بھائی؟

سارے ملزمان چھوٹ گئے بس ایک شخص کو چھ مہینے کی

سزا بے احتیاطی میں ہوئی۔

غریب ہو گا بیچارہ،

لیکن یہ تو دیکھئے قتل میں اور چھ مہینے کی سزا!

جی ہاں یہی تو تماشہ ہے اور قتل رہا ہی کب وکیلوں نے

قتل کا الزام ہی اڑا دیا بے احتیاطی رہ گئی۔

وکیل کیا اُڑائیں گے جی ہم جانتے ہیں حقیقت کو، مثل

مشہور ہے، دائی سے پیٹ نہیں چھپا کرتا ہمیں ساری

باتیں معلوم ہیں وہ تو یہ کہئے کہ آنکھیں جو دیکھتی ہیں وہ آنکھوں میں رہتا ہے اور کان جو سُنتے ہیں وہ زبان پر نہیں آتا، ورنہ دنیا کو معلوم ہو جاتا کیا ہوتا ہے اِن اونچے اونچے بنگلوں میں۔

خیر اِن باتوں کو رہنے دیجئے قانونی جھگڑوں میں نہ پڑیئے آپ تو یہ بتائیے۔ کہ کوتوال صاحب کے تبادلہ کا کیا اثر ہے پبلک پر۔

اتنا اثر ہے کہ آٹھ آٹھ آنسو رو رہے ہیں شہر والے۔ خدا کی قسم ایسا شریف آدمی اب آنے سے رہا۔ بڑے بڑے خطرناک موقعے آئے مگر اللہ کے بندے نے ہندو مسلمانوں کو ایسا قابو میں رکھا کہ پتہ تک نہ ہل سکا۔ اگر وہ چاہتا تو ہزار دفعہ ہندو مسلم فساد کرا دیتا۔ لیکن صاحب بڑا سمجھدار آدمی تھا، وہ جانتا تھا کہ اِن فسادوں نے ہندوستان کو کھوکلا کر دیا،

کوتوال ہو تو ایسا ہو، متفقہ آواز میں ہر اس شخص نے کہا جس کے مُنھ کو بیڑی یا پان نے بند نہ کر دیا تھا،

اور کل جلسہ بھی تو ہو رہا ہے گاندھی پارک میں سنا ہے مسٹر اپنے کچھ فرمائیں گے۔

بس رہنے دیجئے، بولنا تو اور ہی لوگوں کا حصّہ ہے کسی نے سچ کہا ہے۔

نازنین را عشق درزیدن نہ زیبد جان من — شیر مردانِ بلاکش باد ریں غوغا نہند

میں تو کسی پر بھی یقین نہیں رکھتا سب اپنی اپنی کہتے ہیں۔

تو یہ کر وجی سب کو کیوں کہتے ہو ملک میں بڑے بڑے سرفروش موجود ہیں، ہاں اِس میں شک نہیں کہ اکثر ایسے ہی ہیں۔

اور ریڈیو کیا کہہ رہا ہے آج کل ؟ اخبار بینوں کے طبقہ سے تعلق رکھنے والے دماغی خارش کے ایک مریض نے ارشاد فرمایا۔

راوی چین لکھتا ہے!

کیا معنی!

یعنی برطانیہ کی طرف سے اٹلی اور جرمنی پر اتنے بم برسائے جا رہے ہیں کہ روم اور برلن بالکل تنور بنے ہوئے ہیں اور بلیک اوٹ کے دوران میں بموں کی روشنی سے دیوالی کا مزہ آرہا ہے!

اور روس کا کیا حال ہے ؟

روس کی کیا پوچھتے ہو؟ اِس کے یہاں آدمیوں کا تو بالکل وہی حال ہے جو ہمارے گھر کی چارپائیوں میں کھٹملوں کا اور باغوں میں مچھروں کا، مہینے گذر گئے گرم پانی اور اسپرٹ کا لوشن ڈالتے ہوئے مگر کھٹمل ہیں کہ ختم ہونے ہی میں نہیں آتے بس یہی حال سمجھو روس کی فوج کا ابھی تو وہاں ساڑھے سات کروڑ سپاہی اور میدان میں لائے جا سکتے ہیں۔ پھر آ گئے جاڑے جاروں میں سمجھ لو۔ اِن ساڑھے سات کروڑ کی گنتی کہاں تک پہونچیگی۔

ہم نے تو سنا ہے ہٹلر نے اعلان کیا ہے کہ وہ عید کے دن ماسکو میں داخل ہو جائے گا!

بجا ہے، عید تو گذر بھی گئی اور حضرت ابھی ماسکو کو چھو بھی نہیں سکے، ہنوز دلی دور ست والا معاملہ ہے۔

مگر صاحب لڑنے میں یہ روسی بھی بینڈ ھے سے کم نہیں، بموں، توپوں، اور گولیوں کی بارش ہو رہی ہے اور یہ میدان میں ڈٹے ہوئے ہیں ہار جیت تو خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن بقول شاعر کے دِل ناتوان کا مقابلہ قابل داد ہے۔

اور جاپان کے دم خم دیکھ رہے ہو؟

بھائی انٹیا کا یہ تیندوا" تو غضب ہی ڈھا رہا ہے۔

واہ چہ پدی چہ پدی کا شوربا! سمجھتے ہیں آپ؟

یہ کیا کہا جاپان کو معمولی چیز سمجھتے ہیں آپ؟ اِس کے بحری بیڑے کی قوت کا حال معلوم ہے آپ کو؟

جی سب معلوم ہے ہمیں، چین کے افیون نوشوں سے آج تک جاپان نہ نمٹ سکا۔ اب برطانیہ اور امریکہ کے سمندروں میں غوطے کھانے کی بے وقوفی میں مبتلا ہے امریکہ والوں نے تو کہدیا ہے کہ ایک ہفتہ میں جاپان کا سارا بیڑہ غرق کر دیا جائے گا۔

کہنے اور کرنے میں بہت فرق ہے جناب۔

ہم تو یہ جانتے ہیں کہ جاپان کی کوئی چیز مضبوط نہیں ہوتی، وہاں کے جوتے، کپڑے، کھلونے سب ہی تو کمزور ہوتے ہیں آج

لیجئے کل بے کار، بس یہی حال وہاں کی فوج اور بحری بیڑے کا سمجھئے
نہیں صاحب یہ تو روپیہ کمانے کی باتیں ہیں جاپان بہت طاقتور ملک ہے۔
اچھا تو پھر سنگاپور اور ملایا بھی اس سے کم نہیں اُدھر امریکہ اِدھر برطانیہ دو چکی کے پاٹوں میں جاپان ایک دانہ ہے!
ذرا ماچس تو نکالو جی!
کیوں بیڑی بجھ گئی کیا؟
اور آپ بیڑی کے ان کارخانوں ہی کو دیکھ لیجئے۔ ان پر آخر کیا خدائی ایسی مار پڑی کہ تمباکو خراب لگانا شروع کر دیا ہے پینے میں کوئی مزہ ہی نہیں آتا۔
ہر چیز کا یہی حال ہے صاحب، آپ آلوؤں ہی کو لیجئے۔ آلو کھانے میں اب وہ لطف ہی نہیں جو سال بھر پہلے تھا۔
مگر آلوؤں کی تو کاشت ہوتی ہے یہ کارخانوں میں بنائے نہیں جاتے۔
ہاں ہاں یہ تو میں بھی جانتا ہوں میرا مطلب یہ ہے کہ جنگ کی گیسوں سے کوئی چیز نہیں بچی ہاتھ بھر کی گہرائی تک زمین میں گیسوں کا اثر پہنچ رہا ہے،
اور ہماری مرغیوں نے انڈے بہت چھوٹے دینا شروع کر دئیے

ہیں کیا یہ بھی گیس ہی کا کوئی اثر ہے؟
ضرور ہوگا ایک نیم حکیم قسم کے آدمی بولے مرغیوں پر ہی کیسا موقوف ہے۔ اِس سال تو اسقاط اتنے ہوئے ہیں کہ شمار نہیں ہو سکتے ذرا لیڈی ہاسپٹل میں جا کر دیکھئے، اور سب اٹھوا لیتے! پھر بخار اور زکام کے ٹھاٹ دیکھئے، جدھر جائیے بیماروں کا ہجوم شفا خانہ ہے تو وہاں بھیڑ ہسپتال ہے تو وہاں اجتماع دوکان ہے تو یہاں ایک جم غفیر، اور تو اور کلّو درزی کی دوکان پر صبح سے شام تک سو پچاس مریض آجاتے ہیں۔ زکام کا ناس مار گئے، یہ سب جنگ کی گیسوں ہی کا تو اثر ہے۔
اور ہمارے چچا جان کا پرسوں یہاں سے تبادلہ ہو گیا شاید یہ بھی گیس ہی کا کوئی اثر ہو گا۔
نہیں یہ بات نہیں، البتہ جس دن انکے دل کی حرکت بند ہو اس دن پوچھئے گا،
اور یہ تو بتائیے کاغذ کیوں مہنگا ہو گیا ہے اتنا؟ پچھلی صف سے کسی نے پست آواز میں سوال کیا۔
کاغذ؟ سنا ہے توپوں میں کاغذ ہی کے ڈاٹ لگائے جاتے ہیں، پھر جانتے ہو کہ آج کل کی توپیں کتنی بڑی اور چوڑی ہوتی ہیں
نہیں جی ایسی فضول باتیں مت کرو۔ بات یہ ہے کاغذ زیادہ تر فنلینڈ سے آیا کرتا تھا جو اب جرمنی کے قبضہ میں ہے

اِس وجہ سے اب وہاں سے نہیں آسکتا اور ہندوستان میں اتنا کاغذ بنتا نہیں کہ ضرورت کے لئے کافی ہو ادھر اخباروں اور رسالوں کی یہ کثرت ہے کہ ہر صاحبزادہ جس نے بلوغ سے پہلے چھٹا یا ساتواں درجہ پاس کرلیا ہے کسی اخبار یا رسالہ کا ایڈیٹر بنا بیٹھا ہے، رہے اچھے اخبار ان کا یہ حال ہے وہ بارہ بارہ صفحات پر چھپتے ہیں اِسی بنا پر کاغذ مہنگا ہوگیا اور ہمارے ملکی بھائیوں نے شعر اور افسانے اِس کثرت سے کہنا اور لکھنا شروع کردیئے کہ ہر مہینے انہیں سو شعروں اور بارہ افسانوں کے مجموعے شائع کرانے پڑتے۔ اِس صرف نے کاغذ کو اور گراں کردیا۔

ایک بات تو بتادیں سب صاحبان ہمیں ایک ضرورتمند نے کہا۔

پوچھئے کیا بات ہے؟ سب کے سب ایک ساتھ بولے

شہر میں حکیم کون سا اچھّا ہے آج کل؟

حکیموں اور ڈاکٹروں کے متعلق اچھائی اور برائی کا فیصلہ تو ذرا دشوار ہے بھائی!

کیوں؟

بات یہ ہے کہ اچھّے سے اچھّے حکیم اور ڈاکٹر کے علاج سے بھی کوئی نہ کوئی مر ہی جاتا ہے!

موت اور حیات تو خدا کے ہاتھ میں ہے!

پھر سب اچھے ہیں،

اتنے میں بازار کی ایک دوکان میں آگ لگ گئی اور "چوراہہ" کے سارے مدیرین ایک امدادی دستہ مرتب کرکے اِدھر متوجہ ہو گئے۔

تانگہ والا

ہندوستان میں جہاں قوانین کی بہتات افریقہ کے جانوروں کی برابر برابر ہے، ایسی بہت سی چیزیں مِل جائیں گی جن کے مقابلہ میں قانون بالکل اِس طرح خاموش ہو جائے گا جیسے صاحب کلکٹر بہادر کے سامنے میونسپل بورڈ کا چیرمین تانگہ والا بھی ہندوستان کی ایسی ہی مخلوق ہے جو خود تو بہت حد تک قانون پر موثر ہے لیکن اسپر بلکہ اِس کے تانگہ پر صرف نمبر کی حد تک ہی اثر انداز ہوتا ہے؟

تانگہ سال میں ایک مرتبہ جب میونسپل بورڈ میں جاتا ہے تو اِس کا رنگ اور روغن نکھر جاتا ہے اور گھوڑا اِسی نسبت سے دُبلا ہو جاتا ہے، مگر تانگہ کی حیثیت میں کچھ فرق نہیں آتا، البتہ اسکی جیب ذرا ہلکی ہو جاتی ہے مگر جسم اتنا ہی بھاری ہو جاتا ہے کوئی شہر جس میں تانگے چلتے ہیں ایسا

نہیں ہے جہاں شریف اور معزز انسان آباد نہ ہوں لیکن تانگہ والا
جب اپنا نیلا سا چابک لے کر تانگہ پر سوار ہو جاتا ہے تو اُسے
نہ کسی کی شرافت عزیز ہوتی ہے نہ عزّت، وہ صرف اپنے
گھوڑے کی صبا رفتاری پر نظر رکھتا ہے یا راستہ کے پیچ و
خم پر، جس رفتار سے اسے تانگہ چلانا مقصود ہوتا ہے
اُس سے ذرا تیز ہی وہ شہر کی تنگ سڑکوں پر چلاتا ہے
شطرنج کا پیدل تو وزیر بن سکتا ہے مگر ہندوستان کے
پیدل چلنے والے میونسپل بورڈ کے ممبر بھی نہیں ہو سکتے
لہٰذا تانگہ والے کو ان کی خیر و عافیت صرف اپنی حفاظت
کی حد تک درکار ہوتی ہے وہ پیدل چلنے والوں سے بالکل
اِس انداز سے خطاب کرتا ہے جیسے ہٹلر اپنی طوفانی فوجوں سے،
چلو، بچو، ہٹو۔ اے،، ،، ،، ایک طرف کو،، ،، !
اِس کے یہ اطالوی نعرے جن میں نہ پوری شجاعت ہوتی
ہے نہ مکمل بزدلی، ایسے لوگوں کے لئے سخت سوہانِ رُوح
بن جاتے ہیں جن میں احساس یا خودداری کا کوئی کم سے کم
جذبہ بھی موجود ہوتا ہے، لیکن مصیبت یہ ہے کہ ہندوستان کی
آب و ہوا خودداری کی سب سے بڑی دشمن ہے یہاں سیکڑوں
قسم کے کانٹے دار درخت پیدا ہوتے ہیں اور خوب پھلتے بڑھتے
ہیں مگر خودداری کا بیج پھوٹتے ہی مرجھا جاتا ہے یہاں کا ذرہ ذرہ

خودداری اور احساس کے لئے سمِ قاتل ہے پھر تانگہ والا خاص طور پر پیدا ہی اس لئے ہوا ہے کہ وہ خودداری اور احساس کو گھوڑے کی ٹاپوں سے اچھی طرح کچلتا رہے اس کی اس فطرت کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ قیاس ہوتا ہے کہ دُنیا کو سب سے پہلا تانگہ والا یقیناً کوئی صوفی ہوگا، جس سڑک پر کوئی تانگہ دوڑتا ہوا گذر جاتا ہے وہاں خودداری کے سیکڑوں آبگینے چور چور ہو جاتے ہیں جب وہ زور سے پکار کر نہیں بلکہ ڈانٹ کر کہتا ہے :-

دیکھو جی، اب کے چلو، ہٹ جاؤ سامنے سے بڈھے مرے گا کیا؟ لونڈے او لونڈے! بڑھیا دیکھ!

تو بہت سے معزز یا شرفا، جن کے گرد آلود پیر چاہے کتنے ہی قابلِ نفرت کیوں نہ ہوں مگر اِن کی انسانی شرافت یا علمی امتیاز سے میونسپل بورڈ کے چیرمین تو کیا، خود مسٹر چرچل اور ہمارے عزیز دوست مسٹر ایمری کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ اپنا دل پکڑ کر بیٹھ جانے پر مجبور ہو جاتے ہیں مگر میونسپل بورڈ کے ان ممبروں کو جو پیدل چلنے والوں کے ووٹوں ہی سے کامیاب ہو کر ممبری کی عزت سے سرفراز ہوتے ہیں کبھی خیال بھی نہیں ہوتا کہ ان کو کرسی پر بٹھانے والے غریب ووٹر جب اپنے بسیوں سے بنائی سڑکوں پر پیدل چلتے ہیں تو ہٹلر کے غرور و نخوت کا سب سے بڑا علمبردار تانگہ والا، ان کے ساتھ کیسا حقارت آمیز

سلوک کرتا ہے کیا موٹر اور ٹریم کی مشینوں پر اقتدار رکھنے والی میونسپلٹی جو اپنے بنائے ہوئے قانون سے بے زبان سواریوں کی رفتار کو محدود کر سکتی ہے، تانگہ والے کی زبان درازی کا کوئی علاج تجویز نہیں کر سکتی ؟ یا یہ ممکن نہیں کہ انہیں کسی درسگاہ میں دو چار مہینے رکھ کر مہذّب اور شریفانہ الفاظ سکھا دئے جائیں اور قانوناً وہ ایسے الفاظ ہی استعمال کر سکے!

بچئے جناب! بھائی صاحب چلئے!

ذرا ادب کر چلئے!

ہمارے ایک دوست جو شبلی اور آزاد کو محض اس لئے ملزم گردانتے ہیں کہ وہ ناظرین کو بار بار لفظ "تم" سے مخاطب کرتے ہیں چاہتے ہیں کہ تانگہ والوں کی بدتہذیبی کا ردِّ عمل یہ ہونا چاہئے کہ انہیں حضرت قبلہ اور اسی قسم کے دوسرے لکھنوی الفاظ سکھائے جائیں اور اس کا عام انداز گفتگو "ہو"

حضرت ہٹئے!

قبلہ بچئے!

حضرت گھوڑا آمادۂ گستاخی ہے بچکر تشریف لے جائیے،

مگر ممکن ہے لاہور، انبالہ اور سہارنپور کے باشندے اس نسوانیت آمیز انقلاب کو گوارا نہ کریں۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ تانگہ والوں کو یک قلم میدانِ یکہ بازی سے نکال کر تانگہ والیاں ایجاد یا

تصنیف کی جائیں اور انہیں صرف یہ لوری یاد کرادی جائے۔ بچو
چلنے والو کہیں آرہی ہوں!

امید ہے کہ اِس انتظام سے جہاں تانگہ والوں کی خشونت اور بدتہذیبی کا خاتمہ ہو جائے گا، وہاں وارداتِ اغوا میں بھی کمی ہو جائے گی ورنہ اس کی نوعیت تو ضرور بدل جائے گی،

جن شہروں میں فوجی کیمپ کھُل گئے ہیں وہاں کے تانگے والے تو بالکل رستم اور سہراب کے لب و لہجہ میں گفتگو کرنے کے عادی ہو گئے ہیں جب کسی ایسے مقام پر ریل، موٹر یا نصیبِ دشمناں ہوائی جہاز سے اتریئے تو سینکڑوں چابک بدست تانگے والے نظر آئیں گے جو۔

تانگہ چاہیئے!

تانگہ ہونا!

ایک سواری۔ ایک سوئی۔

آو جی!

کی آوازیں لگا رہے ہوں گے، اور جب اِن سے بات کی جائیگی تو امریکہ کے مسلح جہازوں کی طرح حملے کے لئے تیار نظر آئیں گے اور اِس طرح گفتگو کریں گے جیسے آپ تانگہ کرایہ کرنے نہیں آئے بلکہ اِن سے کشتی لڑنے آئے ہیں۔

بارہ آنہ سے کم نہیں ہوں گے،

چلنا ہے؟
اچھا دس آنے بھی دو گے؟
نہیں تو جاؤ!
اگر کبھی بغیر طے کئے بیٹھ جائیے تو بلا مبالغہ یہ اپنے گھوڑے کی پوری قیمت آپ سے وصول کرنے کی کوشش کریں گے اور اگر کوئی زنانہ سواری بھی ساتھ ہے تو پھر ان کے لئے گانا بھی لازمی ہو جائے گا اور گلا چاہے کتنا ہی خراب ہو مگر یہ،
گورے مکھڑے والیاں ؛ کالے بالوں والیاں
اور اسی قسم کے مصرعے اور شعر الاپنا شروع کر دیں گے، جنمیں خواہ رس بالکل نہ ہو مگر خباثت پوری طرح موجود ہو گی۔
لاہور کے تانگے والے اگرچہ راہگیروں کو اپنے تانگہ کی جھلک بموں اور گھوڑے کی ٹھوکریوں سے زخمی کرنے میں بعد دلیر واقع ہوئے ہیں مگر ان کا لہجہ ذرا نرم ہے جب وہ تانگہ کو تیز دوڑاتے ہوئے اپنے خاص انداز میں کہتے ہیں۔

بچو جی!
بائیاں او بائیاں!
تو واللہ ہمیں نیند سی آنے لگتی ہے اور یہ معلوم ہونے لگتا ہے ہم کسی ایسی خلد بریں میں پہنچ گئے جہاں پہونچنے کے لئے مرنے کی شرط نہیں برخلاف اس کے بعض شہروں میں تانگہ

والا اس قدر آزاد ہوتا ہے کہ وہ بے تکلف چلنے والوں کو یہ کہہ کر ڈانٹ دیتا ہے۔

آبے ہٹ! اندھا ہے! آنکھیں کھول کر!

ایسے شہروں کے متعلق ہمیشہ سے ہماری رائے ہے کہ وہاں کے چیرمینوں کو زدغو آغا کی رفاقت کے لیے اٹلی کے کسی قیدخانہ بھیجدیا جائے، اور تانگہ والوں کے لیے تو جہنم کے سوا کوئی اور جگہ تجویز ہی نہیں کی جاسکتی!

ایک تعجب بات یہ ہے کہ اکثر شہروں میں تانگہ والوں کے لئے کسی عمر کی قید نہیں ہوتی۔ اسی سال کا بڈھا جس کی آنکھیں بھی بیکار ہوگئی ہیں اور کان بھی، تانگہ چلا سکتا ہے اور دس بارہ سال کا ایک لونڈا بھی جسے نہ اپنی جان کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے نہ دوسروں کی، اسی کا نتیجہ ہے کہ کرایہ ادا کرنے والے مریض شفاخانہ پہونچنے کی جگہ موٹر سے ٹکرا کر، خدا گنج پہنچ جاتے ہیں ورنہ پاگل خانہ کے دروازے پر جا کھڑا ہونا تو معمولی بات ہے ایک مرتبہ ہندوستان کے ایک مشہور شہر میں ہم نئے نئے وارد ہوئے، ظاہر ہے کہ نوواردوں کی سب سے پہلی ملاقات قلی سے ہوتی ہے یا تانگہ والے سے اور اگر صرف دو ملاقاتوں سے کسی شہر کی اخلاقی حالات کا اندازہ لگایا جائے تو ہر شخص کو کہنا پڑے گا کہ ہندوستان کا کوئی شہر بھی مہذب نہیں اسٹیشن پر پہونچتے ہی ہم بھی اِن دونوں مہربانوں سے ملے اوّل

اللہ کرنے بھی اپنی عنایاتِ بے غایات سے نوازا۔ دوسرے صاحب کا تو ذکر ہی کیا ہے قلی نے ایک صاف ستھری جگہ ہمارا سامان رکھ کر تانگے والے سے تعارف کراتے ہوئے کہا۔ بابو شہر جائیں گے کیا لے گے حالانکہ ہماری رائے میں بابو یا کسی انتہائی بیوقوف آدمی کو کہہ سکتے ہیں یا کسی بہت عقلمند انسان کو،

بارہ آنہ تانگہ والا بولا۔

قلی نے ہماری صورت اس انداز سے دیکھی گویا یہ بہت غنیمت ہے اور تانگہ والا بڑی مسافر نوازی سے کام لے رہا ہے!

آٹھ آنہ لو گے؟ ہم نے پوچھا،

آٹھ آنے! تانگہ والے نے تیوری پر بل ڈال کر نہایت حقارت سے کہا، دیجئے بابو جی بارہ آنہ زیادہ نہیں ہیں قلی نے کہا، ہندوستان بلکہ ساری دُنیا میں فیصلے اب کثرت رائے سے نہیں ہوتے بلکہ طاقت سے ہوتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ تنہا قلی بھی ہم سے قوت میں کچھ زیادہ ہی تھا، پھر تانگہ والے کو بھی شامل کر لیا جائے تو ادھر گویا ہارس پاور کا انجن بن جاتا لہٰذا ہم نے بارہ آنے تسلیم کر لئے تانگہ والا ہمارے میزبان کا نام پوچھکر نہایت تیزی سے چلا اور جلد ہی ایک صاحب کے دولتخانہ پر پہنچ گیا جس کے شاندار دروازے پر تختۂ تعارف لگا ہوا تھا، اور جلی حروف میں لکھا ہوا تھا عبدالرشید وکیل ہائی کورٹ

ہمارے میزبان کے نام میں تو کوئی غلطی نہ تھی مگر پتہ بہت غلط لکھا تھا تاہم اِس خیال سے کہ ممکن ہے یہاں ڈاکٹر کو وکیل ہی کہتے ہوں ہم اُتر گئے اور عبدالرشید صاحب کے دفتر وکالت میں جا بیٹھے۔ جلد ہی عبدالرشید صاحب آ گئے اور ہماری حیرت بلکہ سراسیمگی پر غور کئے بغیر اُنھوں نے مصافحہ کرتے ہی پوچھنا شروع کر دیا۔

جناب کا اِسم شریف؟

دولت خانہ؟

مقدمہ کِس عدالت میں ہے آپ کا؟

اچھا ہوا آپ پہلی گاڑی سے ہی آ گئے ورنہ میں نہ ملتا آج بڑی مصروفیت ہے، قتل کی دو پیشیاں ہیں،

یہاں آپ کو ہر قسم کا آرام مِلے گا!

آپ کا گھر ہے یہ،

آپ آرام کریں، بس مختصر واقعات مقدمہ کے مجھے سُنا دیں، ہم اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ اِن کا یہ اخلاق پائدار نہیں جب اِنھیں معلوم ہوگا ہم اِن کے "موکل" نہیں بلکہ "مہمان" ہیں تو ضرور خفا ہو جائیں گے ہم نے پوری سنجیدگی کے ساتھ کہا:۔ جناب میں ڈاکٹر عبدالرشید کے یہاں جانا چاہتا تھا تانگہ والا یہاں چھوڑ گیا براہ کرم ایک تانگہ منگا دیجئے۔

بہت اچھا، انھوں نے کافی شرمندگی کے ساتھ کہا۔ اور ملازم کو جلد تانگہ لانے کی ہدایت کر کے اندر چلے گئے حالانکہ اب چائے کا وقت آگیا تھا اور وہ چاہتے تو ہمیں یہ زحمت دے سکتے تھے!

فلاسفر

فلاسفر کی علمی تعریف تو معلوم نہیں کیا ہے۔ مگر عام زبان میں فلاسفر کہتے ہیں ضدّی، کج بحث اور لایعنی گفتگو کرنے والے بیوقوف انسان کو جس کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ ہر معاملہ میں اپنی ہمہ دانی کے جواہر دکھانے کی کوشش کرتا ہے، اور کوئی عنوان گفتگو کا ایسا نہیں ہوتا جس میں وہ اپنی حکمت سخن کی حماقتیں شامل نہ کرتا ہو، اور اس حقیقت کو بڑے بڑے وطن پرستوں نے بھی تسلیم کر لیا ہے کہ ارض ہند میں بیوقوفوں کی مردم شماری زیادہ ہے۔ اس لئے ماننا پڑیگا کہ ہندوستان میں دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں فلاسفروں کی پیداوار بھی زیادہ ہے۔ یونان کو فلسفہ سے گہرا تعلق تھا۔ مگر اب تو یونانی اطبّاء اور یونانی دواخانوں کے علاوہ یونان کا کوئی نام لیوا باقی ہی نہیں رہا اور خوش قسمتی سے باقیات الصالحات کی یہ اُمّت مرحوم بھی ہندوستان ہی میں آباد ہے۔ اب اِس انکشاف سے انکار کرنے کی کوئی وجہ ہی باقی نہیں رہی کہ فلاسفروں کی مرکزیت کا شرف

ہندوستان اور صرف ہندوستان کو حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں ہوٹل سے لیکر قبرستان تک فلاسفر پھیلے ہوئے ہیں۔ کوئی جگہ چاہے وہ دواخانہ ہو یا پاگل خانہ اِن فلاسفروں سے خالی نہیں۔ قطب صاحب کی لاٹ پر جائیے تو یہ فلاسفر نظر آئیں گے، اور اجنٹا یا ایلورا کے غاروں میں جائیے تو اِن فلاسفروں سے واسطہ پڑے گا۔ گرمی کی دوپہر کسی ہوٹل میں گذار کر دیکھ لیجیے۔ وہاں اگر جنگ کے متعلق نہیں تو اور کسی سیاسی عنوان پر ایسی گردن توڑ بحث چھڑی ہوتی ہوگی کہ سننے والوں کو اپنی عافیت اور خیریت کے پیش نظر کانوں پر ہاتھ ہی رکھنے پڑیں گے۔ مناظرہ اور مباحثہ کرنے والے دو حریفوں میں سے ایک ہونے گا تو یہ ثابت کرنیکی کوشش کریگا کہ وہ ہربرٹ اسپنسر کی اولاد میں سے ہے۔ دوسرا بھی اِس کے جواب میں اپنا رشتہ ڈاروِن سے نہیں تو پروفیسر جیمس سے ضرور ملائیگا۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک دوسرے کے نقطۂ نظر سے اختلاف کریگا۔ ایک چائے کو برف سے زیادہ سرد کہے گا تو دوسرا اُسے آگ سے زیادہ گرم بتائے گا۔ یہ اختلاف بڑھتے بڑھتے جیب و گریبان تک پہنچ جائے گا اور تھوڑی دیر میں "فساد گندم" اپنی پوری طاقت سے قدرتی طور پر جلوہ فرما ہوتا ہے، کم از کم یونان کا محاذ جنگ ضرور بن جائے گا۔ فلاسفروں کی کثرت پیدائش اور اِس سلسلہ میں "برتھ کنٹرول" کی ناکامی کا یہ اثر ہے کہ جو مقامات خاموشی اور سکون چاہتے ہیں وہاں بھی گفتگوؤں اور تقریروں کی

کی ہنگامہ خیزیاں زمین و آسمان ایک کر دیتی ہیں مسجدوں میں جائیے تو وہاں بھی علم الکلام کے ماہرین جمع ہوں گے؛ اور کسی نہ کسی مذہبی مسئلہ پر دادِ جہالت دے رہے ہوں گے۔ کوئی ڈاڑھی منڈانے والے کو کافر کہہ رہا ہوگا، کوئی قوالی سننے والوں کو دائرۂ اسلام سے نکال رہا ہوگا۔ اپنے کسی مرنے والے کی مشائعت میں قبرستان تک چلے جائیے تو وہاں بھی فلاسفرانِ ہندوستان اپنی عقل و خرد پر مرثیہ خوانی کرتے ہوئے سنائی دیں گے۔ ایک مرتبہ رات کی خاموش تاریکی یا تاریک خاموشی میں اپنا ایک ناگوار فرض ادا کرنے ہمیں بھی ذرا قبرستان تک جانا پڑا، اگرچہ یہ سفر اپنے ہی پیروں سے طے کرنا پڑا تھا، پھر بھی ہمارے لبوں پر سکوت اور زبان پر خوف و عبرت کا ایک فالج طاری تھا، لیکن ایک فلاسفر پر انِ حوادث کا اثر ہو جائے تو وہ حقیقتاً فلاسفر ہی نہیں، چنانچہ ایک ہیدلیستی فلاسفر نے قبر کے ہیبت ناک گڈھے کی طرف جھک کر فرمایا، "قبر غلط کھدی ہے"، دوسرے فلاسفر نے کہا کیوں غلط کھدی ہی ٹھیک تو ہے، ٹھیک، تو ہے؟ ٹھیک کیونکر ہے دیکھو رُخ کدھر کو ہے۔

کدھر کو ہے؟

مغرب اور مشرق کو!

یہ کیونکر؟

ہم کہتے ہیں اور کیونکر؟

آپ کا کہنا سند نہیں!

ہمارا کہنا تو ڈیلوما ہے ڈیلوما!

اتفاق سے قریب ہی مسجد واقع تھی جس کا رُخ بالاتفاق مغرب ہی کی طرف ہوتا ہے۔ ایک بزرگ نے مسجد کی طرف اشارہ کر کے کہا دیکھو مسجد کا رخ دیکھو!

مسجد کا کیا دیکھو، کیا مسجد غلط نہیں بن سکتی۔

پھر قبر کو بھی غلط ہو جانے دو!

یہ اور بات ہے، ورنہ قطب نما رکھ کر دکھائے دیتا ہوں کہ قبر کا رُخ غلط ہے!

بھائی کہہ تو دیا جہاں مسجد غلط ہو سکتی ہے وہاں قبر بھی غلط ہو جانے دو!

اسی سلسلہ میں ایک اور صاحب دخل در معقولات کر کے گورکن کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولے، کیسی فضول باتیں کرتے ہو، مجو اتنا بیوقوف نہیں ہے، اس نے عمر بھر یہی کام کیا ہے تمہارے باپ دادا کو اسی نے دبایا، بستی کے سیکڑوں بڑے بوڑھوں کو اس نے دفن کیا، اور کہتے ہو قبر غلط ہو گی، ایسا نہیں ہو سکتا!

اب مجو خاں پر بھی فلاسفری کا ہلکا سا دورہ پڑا، اور وہ پھاوڑہ زمین پر اپنے گرد آلود ہاتھ سے پیشانی کا پسینہ پوچھتے ہوئے بولے اللہ جھوٹ نہ بلائے، اب تک کئی ہزار قبریں کھود چکا ہوں، اور

ایک انچہ کا فرق نہیں پڑا، میں نے بڑے بڑے پہلوان، مولوی پٹھان سید اور مغل و با دیئے۔ سیکڑوں عورتوں اور بچوں کو یہاں سُلا دیا آج تک کسی نے یہ نہیں کہا کہ مجو نے قبر کھودنے میں ہو تو ہی یا غلطی کی، پھر تم چاروں کے لونڈے کس مُنہ سے کہہ سکتے ہو، مجو کوئی دیوانہ نہیں ہے، اس کی نگاہیں ایسی جچی تلی ہیں کہ جہاں پھاؤڑا مار دے وہیں قبر تیار ہو جائے۔

اس تقریر سے فلاسفر صاحب کی "توہین بالقصد" ہو گئی تھی اس لئے وہ لیجسلیٹو کونسل کے قوم پرست ممبر کی طرح قبرستان سے واک آؤٹ کرنے پر آمادہ ہو گئے، مگر کسی نے قریب جا کر کہا بھائی صاحب یہ حرکت ٹھیک نہیں، ہیضہ کا زمانہ ہے خدا جانے کب رزق پانی اُٹھ جائے اور اس ویرانہ میں گھر بنانا پڑے، عقلمندی کی بات یہ ہے کہ یہاں سے اس طرح مت جاؤ! کیا آپ کو یہ خوف ہے میں مر جاؤں گا تو مجھے دفن کرنے کوئی نہ آئے گا؟

جی ہاں میرا یہی مطلب ہے!

آپ اطمینان رکھئے میں ایسی جگہ مرنا پسند نہیں کروں گا، جہاں علاج بھی غلط ہوتا ہو، اور قبریں بھی غلط کھودی جاتی ہوں،

اور کہاں مریں گے آپ؟

جہاں یہ غلطیاں نہ کی جاتی ہوں۔

مگر ہیضہ تو یہاں ہو رہا ہے!

اس سے کیا بحث کہیں ہو؟

کیا تمہیں یقین ہے تم زندہ یہاں سے چلے جاؤ گے۔ خدا کی قسم تم ہیضہ سے بچ گئے تو کسی دن یہاں کے "ہندو مسلم" فساد میں ضرور کام آجاؤ گے، کیونکہ اس قسم کے فساد تم جیسے فلاسفروں کی تیر گیت ہی سے ہوا کرتے ہیں، اس لئے چُن چُن کر فلاسفر ہی مارے جاتے ہیں جب وقت تک زندہ انسانوں کا یہ ہجوم "شہر خموشاں" کی عبرتناک حدود میں رہا، برابر کسی نہ کسی عنوان پر گفتگو جاری رہی، قبر کا مسئلہ ابھی طے نہ ہوا تھا کہ مرنے والے کی موت کا سبب معلوم کرنے کی کوشش کے سلسلہ میں ایک بزرگ بولے، دیکھو کل تک غریب اچھا خاصا تھا، ذرا سی دیر میں کیا سے کیا ہو گیا، بھائی ویسے تو تقدیر میں یہی تھا، مگر میں یہی تو کہوں گا۔ علاج ٹھیک نہیں ہوا

علاج ٹھیک کیوں نہیں ہوا، ایک دوسرے اہل تحقیق چین بہ جبیں ہو کر گویا ہوئے ہزاروں روپئے پر پانی پھر گیا، اور آپ کے نزدیک علاج ٹھیک نہیں ہوا۔

جی ہاں، میں تو یہی کہونگا، بات یہ ہے بیماری کچھ تھی اور علاج کچھ ہوا۔

پھر آپ کی رائے میں شہر کے سارے حکیم اور ڈاکٹر بیوقوف ہیں، کسی کی سمجھ میں مرض آیا ہی نہیں۔

جی ہاں ایسا نہ ہوتا تو آپ یہاں میلوں تک قبروں کے نشیب

وفراز کیوں دیکھتے، یہاں کوئی پانی پت کی لڑائی تو ہوئی نہیں یہ ساری قبریں انسانوں کے اِن محسنوں ہی کے فیض التفات کا نتیجہ ہیں۔

میں اِس بات کو نہیں مانوں گا، موت وحیات کسی کے ہاتھ میں نہیں ہے۔

پھر علاج کیوں کرتے ہیں آپ، جب عقیدہ یہ ہے کہ موت وحیات کسی کے ہاتھ میں نہیں تو علاج بیکار ہے۔ اِس حماقت سے آخر فائدہ؟

علاج کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم معالجوں سے زندگی مانگنے جاتے ہیں۔

پھر کیا دوا یا موت ہی مانگنے جاتے ہیں آپ اُن سے؟

جی ہاں، یوں ہی سمجھ لیجئے۔

اور اِس سے نتیجہ، وہی موت؟

بھائی چپ رہو، میرا دماغ مت کھاؤ، معلوم نہیں تمہارے سر میں کیا بھرا ہے؟

آپ اطمینان رکھئے، میرے سر میں عقل و دماغ کے سوا کچھ نہیں ہے مجھے تو اور کچھ معلوم ہوتا ہے!

اور کیا ہوگا، بھُس، یا گوبر، کیوں یہی کہنا چاہتے تھے آپ؟

خدا کی قسم آپ ذاتیات پر اُتر آئے ہیں، اور علمی گفتگو سے ذاتیات سے

بحث کرنا گویا دست بدست لڑائی کی دعوت دینا ہے، اور میں اِس میں بھی آپ سے ہارنے والا نہیں ہوں، کیا کہوں قبرستان ہے اچھا پھر کبھی سمجھوں گا۔

اِس بحث کے دوران میں کام اِس حد تک پہنچ چکا تھا کہ قبر پر پتھر جمائے جا رہے تھے، ہر شخص کی توجہ اُدھر جذب ہو گئی اور سب جھجک جھجک کر دیکھنے لگے۔ ہندوستان کے قانون میں چاہے حق رائے دہی سب نابالغوں کو حاصل نہ ہو۔ مگر عام جلسوں میں ہر بالغ و نابالغ کو یہ حق حاصل ہوتا ہے، اور وہ بڑی بیدردی سے اِس حق کو استعمال کرتا ہے یہاں بھی سب ایسے ہی حضرات تھے، جن کو اپنی رائے آزادانہ پیش کرنے کا مجاز تھا۔ چنانچہ اِس نازک موقعہ پر بھی ایک فلاسفر نے کہا! بیچ کے پتھر کو ذرا دبا دو!

دوسرے بولے درمیانی سوراخوں میں اچھی طرح مٹی بھر دو!

دیکھو اِس پتھر کا سرا توڑ دو!

کیوں توڑ دو کیا نقصان ہے اِس سے؟

اندر کو جھکا ہوا ہے؟

جُھکا رہنے دو!

نہیں میت کو تکلیف ہو گی۔

تکلیف کا خیال ہے تو اس کے پاس لیٹ جائیے نا!

کیسی باتیں کرتے ہو جی، دماغ چل گیا ہے کیا تمہارا؟

دماغ تو آپ کا چلا ہو گا، مگر ہمدردی کے معنی تو یہی تھے کہ آپ بھی لیٹ جاتے!

اچھا خاموش ہو جائیے، ایک سرد مزاج فلاسفر نے چیخ کر کہا اس پر خدا خدا کر کے یہ جہاد "باللسان" ختم ہوا۔ مگر پہلے فلاسفر کو یہ اعتراض اب بھی باقی رہا کہ قبر غلط کھدی ہے، اور کئی ہفتہ تک وہ اس تحقیقات میں مصروف رہے۔

ہندوستان میں دوکانوں، اسٹیشنوں، ریل گاڑیوں، مسافر خانوں تالابوں، ندی کے گھاٹوں، مذہبی و سیاسی اجتماعوں غرض ہر مقام پر کوئی نہ کوئی "فلاسفر" ہر وقت موجود رہتا ہے اس لئے جب آپ بولنا چاہیں ذرا سوچ سمجھ کر بولیں۔ کیونکہ بعض فلاسفروں کے نزدیک بحث بہت جلد ذاتیات کی حد تک پہنچ جاتی ہے اور جب ان کے عقیدے میں یہ نوبت آجاتی ہے وہ فوراً جارحانہ اقدام پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ پتلے دبلے فلاسفروں سے تو زبانی گفتگو کے مقابلہ میں آدمی اس جارحانہ اقدام ہی میں جیت جاتا ہے۔ مگر ہر فلاسفر ایسا نہیں ہوتا۔ اس لئے بحث شروع کرتے وقت

شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

کے "کاشن بورڈ" پر ضرور نظر رکھئے۔

شاعر

شعر گوئی کے اسباب پر ادبی نقطہ نظر سے ہٹ کر غور کیا جائے

تو بہت کچھ سوچنے سمجھنے کے بعد یہی فیصلہ کرنا پڑے گا کہ شعر گوئی اور جنوں کا مادہ بالکل ایک ہے، جراثیمی اصول سے بھی شاعری اور جنوں میں زیادہ فرق نہیں جراثیم قد و قامت میں اتنے بڑھ جائیں کہ خود مبنی ذرائع کی ضرورت باقی نہ رہے، تو جنوں لاحق ہو جاتا ہے ورنہ دماغ شاعری کا جولانگاہ بن جاتا ہے، قدیم فلاسفروں کا قول ہے کہ فطرت بخیل نہیں ہوتی، لہٰذا مادہ جس صورت کو قبول کرنیکا اہل ہو جاتا ہے وہی صورت اُسے بخش دی جاتی ہے، یہی فیاضی جنون اور شاعری میں نظر آتی ہے یعنی مادہ ذرا زوردار ہو گیا تو دماغ میں جنوں کی نیرنگیاں اور کارفرمائیاں برسرکار آگئیں، اگر اس حد تک معاملہ نہ پہونچا تو ذوق شاعری بخش دیا گیا بہرحال یہ دونوں چیزیں ہیں قدرت اور فطرت کے خاص عطیات میں شامل، شاعر دُنیا کی چیزوں کو اپنے نکتہ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ بھائی مجنوں بھی ساری دُنیا کو نہیں تو اپنی لیلیٰ اور سلمیٰ کو تو ضرور اپنی مخصوص اور حسن سنج نگاہوں سے دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ جس ذرہ خاک کو مرکز محبت بنا لیتے ہیں وہ "بندۂ پاک" ہوئے بغیر نہیں رہتا خواہ اس سے کہ خط و خال میں فن تنقید کے اصول سے کتنی ہی غیر معشوقانہ خصوصیات ثابت کر دی جائیں مگر وہ جسے محبوب کہہ چکے ہیں وہ ہمیشہ محبوب ہی رہے گا۔ شاعر خواہ طنزیہ انداز میں کتنا ہی کہتو مجنوں ہنیچ ایک ہی لیلیٰ کے ہو رہیں رہتا ہے ساتھ اپنے یا اک نگار رونہ

مگر وہ اِس طائرانہ اور قہریانہ طریق محبت کو کبھی تسلیم نہ فرمائیں گے شاعر کے لئے کسی علمی امتیاز یا فنی تبحّر کی بالکل ضرورت نہیں، جیسے جنون کے لئے کسی قوم اور فرقہ کی قید نہیں بس اِس کام کے لئے فطرت کی فیاضانہ عنایات اور شاگردوں کی تعداد کو باعث نجات سمجھنے والے اُستاد کی غیر شاعرانہ توجہات کافی ہیں جس قصلی اور برساتی شاعر کو یہ چیزیں حاصل ہو جاتی ہیں وہ لازمی طور پر لسان الغیب اور نوائے سروش کو جذب کرنے والا ریڈیو اسٹیشن بن جاتا ہے اِس کے بے تکے اشعار استاد کے فیض توجہ سے قابل اشاعت ہو جاتے ہیں ضرورت واقع ہونے پر استاد مکرم دو چار اشعار اپنی طرف سے ارشاد فرما کر تلمیذ رشید کے فسانہ خون میں اضافہ کر دیتے ہیں جب شعر سنانے کا موقعہ آتا ہے تو تحریک خاکسار کا یہ سپاہ سالار اعظم جس کی جیب میں ہر وقت ایک غیر مطبوعہ دیوان موجود رہتا ہے فرمائش کرنے والوں کو متشکرانہ نگاہوں سے دیکھ کر لہجہ میں پوری نسوانیت پیدا کر کے بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ کہتا ہے حضرات اِس وقت تو طبیعت حاضر نہیں معاف فرمائیے پھر کسی وقت عرض کروں گا،

نہیں جناب کچھ تو فرمائیے طبیعت کی بہتر فی صدی غیر حاضری جب شعر کہنے میں مانع نہیں ہوئی تو شعر سنانے میں کیونکر بارج ہو گی، حضرت مجھے معذور رکھئے کچھ یاد بھی تو نہیں،

بیاض تو ہوگی جیب میں اس میں سے کچھ سنا دیجئے
بیاض، واللہ حضرت، بیاض تو میں جیب میں رکھتا ہی نہیں کرتا،
بہرحال سنائیے کچھ تو سنائیے سامعین سخت مشتاق ہیں،
حسن سماعت ہے جناب کا، حضرت آپ تو بہت ستاتے ہیں
اشعار گو اس قابل نہیں مگر بہ نیت اصلاح پیش کرتا ہوں،
فرمائیے، فرمائیے، بہت اشتیاق ہے سب کو۔
اس کے بعد شاعر صاحب اپنی تمام غیر قانونی مگر مذہبی قسموں
کو فراموش کر کے جیب سے دیوان نکالیں گے اور ہندوستان
کے کسی کامیاب اور مشہور شاعر کا نام لے کر فرمائیں گے۔
سنئے حضرت ایک غزل جناب ” “ کی غزل پر لکھی ہے،
شاید پسند خاطر ہو، چنانچہ غزل پڑھی جائے گی اور بقول شخصے شاعر
نامبردہ کی غزل کا کوئی مصرعہ ایسا نہ ہوگا جس کا چربہ نہ اتار لیا ہو،
اس قسم کے حضرات جب مشاعروں میں پہنچ جاتے ہیں تو انکی
خاصی تواضع ہو جاتی ہے،
ایک مرتبہ مجلس مشاعرہ کے دوران میں ایک لب گور شاعر،
نیم جان بانی مجلس کو نظر آ گئے، وہ فوراً نہایت ادب و احترام سے
انہیں اٹھا کر مسند شاعری کے قریب لے آئے اور بڑے اصرار سے
عرض کیا حضرت کچھ ارشاد فرمائیے،
حضرت نے اپنے اور اپنے بھائیوں کی مخصوص انداز خاکساری

میں انکار کیا اُدھر سے مبالغہ ہوا۔ آخر اُنھوں نے سینہ اور صدری کی درمیانی فضا سے ایک ضخیم اور غیر مجلّد دیوان نکال کر ہاتھ میں لے لیا اور پڑھنے کے ارادہ سے تشریف لائے، کسی نے پچھلی صف سے چیخ کر پوچھا کیا میلاد پڑھئے گا؟

غزل عرض کرتا ہوں، اُنھوں نے صوتِ لرزاں میں غصّہ کی لرزشوں کا اضافہ کرتے ہوئے فرمایا، کتنی غزلیں پڑھئے گا؟ پھر سوال ہوا،

اے معاذ اللہ! ابھی تو شروع بھی نہیں کیا اُنھوں نے جھلّا کر کہا پھر ایک نہایت طویل اور بہت بے کیف غزل اپنے گریہ خیز اور اشک آور ترنّم میں شروع کی، اوّل تو غزل خراب، پھر پڑھنے کا لہجہ سماعت دوز، دس بارہ اشعار سننے کے بعد کسی نے کہا واہ واہ کیا غزل پڑھی ہے! دوسرے صاحب بولے واقعی مطلع غضب کا تھا، اور مقطع جو حضرت اب پڑھنے ہی والے ہیں غزل کی جان ہے!

شاعر صاحب اِس رمز کو سمجھے بغیر نہایت خلوص سے اپنے کام میں مصروف رہے،

واللہ مقطع لاجواب ہے،

شاعر صاحب حیران تھے ابھی مقطع پڑھا نہیں، اور تعریف شروع ہوگئی یہ کیا راز ہے کیا میری غزل مسروقہ ہے اگر

ایسا ہے تو اُس کی ذمہ داری مجھ پر نہیں جناب استاد پر ہے جنھوں نے میری غزل پر اصلاح دینے کی بجائے یہ پُوری غزل ہی ارشاد فرما کر بھیجدی تھی، جب اِدھر سے بے حسی کا اظہار ہوا تو مجمع سے مزاح نگاروں کا حوصلہ بڑھ گیا چنانچہ پھر ایک آواز بلند ہوئی "مقطع فرمایئے مقطع"،

شاعر صاحب اِن باتوں کی پروا کرنے والے نہ تھے بدستور پڑھتے رہے سامعین اِس وبائی شاعر کی طویل غزل سے گھبرا اٹھے تھے کسی نے درد بھری آواز میں کہا:-

روئیے مومنین روئیے!

معاً رونے کی متعدد آوازیں آئیں ادھر شاعر صاحب غزل پڑھ رہے ہیں اُدھر سامعین رو رہے ہیں لیکن مقطع پڑھنے کی نوبت نہیں آتی۔ آخر پھر ایک صاحب نے رو کر بہت اصرار سے کہا حضرت مقطع پڑھئیے، جلدی سے مقطع، واللہ کلیجہ پھٹا جاتا ہے اب صبر نہیں ہوسکتا،

شاعر صاحب نے دیوان بند کر دیا اور مقطع پڑھنے سے پہلے غزل ختم کردی،

اِس موقعہ پر کسی ہمدرد نے انہیں یقین دلا دیا کہ آپ کا کلام تو بہت اچھا ہے مگر گلا اچھا نہیں یا تو گانا سیکھیے ورنہ کسی خوش گلو آدمی کو ساتھ رکھا کیجئے، اور اس سے اپنی غزل پڑھوا دیا کیجئے

آپ نے اِس مخلصانہ مشورہ پر عمل شروع کر دیا۔ مگر پہلے ہی تجربہ سے ثابت ہو گیا، کہ اِس طرح داد گانے والے کو ملتی ہے سننے والے کو نہیں اور اکثر سامعین پڑھنے والے ہی کو شاعر سمجھ لیتے ہیں آپ نے اِس غلط فہمی کا ازالہ اِس طرح کر دیا کہ جب آپ کا نام پکارا گیا تو اُدھر آپ نے ترتیب کردہ گانے والے کو اُٹھنے کا اشارہ کیا اُدھر خود کھڑے ہو کر چاروں طرف گھوم کر دونوں ہاتھوں سے حاضرین جلسہ کو آداب کیا اور یقین کر لیا کہ اب کسی غلط فہمی کا موقعہ نہیں رہا مگر اِس حرکت کی تکرار ضروری تھی، چنانچہ آپ کا اجیر غزل پڑھ چکا تو آپ نے دوبارہ کھڑے ہو کر آداب و تسلیمات کا سلسلہ شروع کیا اِس پر پھر واہ وا، سبحان اللہ کا غلغلہ بلند ہوا۔ اور کسی بدتمیز نے زور سے کہا تھا جو استاد مجرا عرض کر رہا ہے۔

شاعر صاحب نے اِس بیہودہ اور غیر مہذب جملہ کو بڑی متانت اور دانشمندی سے برداشت کر لیا مگر اِس فکر میں پڑ گئے کہ اِس رسم سلام کو جاری رکھا جائے یا نہیں ؟

آپ کی ایک عجیب و غریب خصوصیت یہ تھی کہ ہر شخص کے عیب و ثواب کو اپنی شاعری کے نقطۂ نظر سے دیکھا کرتے تھے، جس کے متعلق معلوم ہو جاتا کہ وہ اِن کے اشعار کی تعریف کرتا ہے اُسکی وہ بھی مدح و ثنا کرتے، ورنہ سخت توہین اور مذمت کیا کرتے ایک مرتبہ چند دوستوں میں بیٹھے ہوئے ایک مشہور عالم کی بُرائی

کو رہے تھے اور بہت سخت ناراضی کا اظہار فرما رہے تھے، کم بخت نہایت بے ایمان، ضمیر فروش اور وطن دشمن آدمی ہے اتنے میں کسی نے آہستہ سے کہا مولانا یہ تو سب ٹھیک ہے مگر وہ آپ کے اشعار کو بہت پسند کرتے ہیں یہ سنتے ہی وہ فوراً بول اُٹھے بھائی بات یہ ہے کہ وہ بڑے زبردست عالم ہیں، اشعار کو خوب سمجھتے ہیں سچ تو یہ ہے کہ اُنھوں نے ہندوستان بھر میں ہمارے ضلع کا نام روشن کر دیا، اور میاں یہ تو سارے اتہام ہیں ورنہ حقیقت میں وہ بے ایمان یا ضمیر فروش ہو ہی نہیں سکتے آخر ہے کس باپ کا بیٹا!

ایک دن کسی اور کی تعریف توصیف میں رطب اللسان تھے، اتفاق سے اسی زمانہ میں ان لیڈر صاحب کو سیاسی اختلاف کی بنا پر کسی جلسہ میں بُرا بھلا کہا گیا آپ ان کی حمایت فرما رہے تھے کمبختوں نے بُرا کیا اُسے گالیاں دیں بڑی بد تہذیبی کی بات ہے کہ ایک لیڈر کی بر سرِ جلسہ توہین کی جائے، سچ بات یہ ہے کہ ان شریروں نے ہماری عزت پر ہمیشہ کے لئے بٹہ لگا دیا۔ ہمارے قصبہ کو رسوا کر دیا۔ ایک صاحب نے کہا مولانا یہ تو درست ہے مگر یہ شخص ہے جو آپ کے کلام کی سخت مذمت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مولینا کو کہنا بالکل نہیں آتا۔ وہ اساتذہ کے دیوانوں کی نقل کر دیتے ہیں،

آپ نے جلدی سے پہلو بدل کر ارشاد فرمایا بھائی یہ خباثت تو ضرور ہے اس میں، ایسی صورت میں اگر مجمع نے اُن کو بُرا بھلا کہا تو کچھ بیجا نہیں کیا

وہ اِس سے زیادہ کے مستحق تھے، آخر ہے کس خاندان کا آدمی، خدا کی قسم قوم کا جولاہہ ہے ::

چھتری

چھتری کی بہت سی قسمیں ہیں مثلاً ہوائی چھتری، برساتی چھتری تعزیہ کی چھتری، ایک چھتری اور رہی جاتی ہے یعنی چھتری قوم، پھر لطف یہ ہے کہ چھتریوں میں تذکیر و تانیث بھی پائی جاتی ہے چھتری مونث ہے اور چھتر جو چھتری سے بڑا ہوتا ہے مذکر، آج کل دو قسم کی چھتریاں زیادہ رائج ہیں ہوائی اور برساتی، ہوائی چھتری میدان جنگ میں کار آمد ہے، ہندوستان میں کراچی کے حدود میں برحال ہی میں ہوائی چھتریوں کا تجربہ ہوا ہے، مگر برساتی چھتری سب چھتریوں میں زیادہ عام ہے، اور یہی اس وقت موضوع گفتگو ہے یوں تو ہر چیز کی طرح چھتری بھی کافی گراں ہو گئی ہے لیکن ضرورت کی چیز کتنی ہی گراں ہو جائے اسے بہم پہونچانا ہی پڑتا ہے ظاہر ہے کہ برسات میں ہر عمر کے آدمیوں کو پچانوے فی صدی چھتری کی ضرورت ہوتی ہے باقی پانچ فیصدی آدمی وہ بھی جوانوں میں ایسے رہ جاتے ہیں جو چھتری کے مقابلہ میں محبوب یا پینے کی کسی چیز کو برسات کے ضروری بند و بست میں داخل سمجھتے ہیں اور ایک یاد دا ایسے بھی ہوں گے، جن سے کے

نزدیک "برساتی" بارش کی ہر مشکل کا علاج ہے ہم لوگوں میں ہیں جو عمر، مزاج اور اقتصادی نقطۂ نظر سے چھتری کے سو فی صدی ضرورتمند ہیں یہی وجہ ہے کہ اساڑھ شروع ہوتے ہی ہمیں چھتری خریدنے کی فکر لاحق ہو گئی جو اس وقت اور شدید ہو گئی جب کپڑے بدل کر ایک روز ہم ٹہلنے لگے، اور واپسی میں یکایک بارش ہونے لگی، ہمارے علاوہ سڑک پر چلنے والے سب "بندگان مبارک" کی قوم سے تعلق رکھتے تھے جو گھر سے چھتریاں لے کر چلے تھے بوندا باندی شروع ہوتے ہی اُنھوں نے اپنی کالی، پیلی، نیلی اور سفید چھتریاں کھولکر قدرت کے ساتھ جنگ گریز کا اعلان کر دیا۔ اور ہم ٹوپی ہاتھ میں لے کر سر ذرا نیچا کر کے پانی کی بڑی بڑی بوندوں کو لمبے بالوں میں جذب کرنے لگے اور پاجامے کے پائنچے چڑھا کر لگے گھر کی طرف بھاگنے، چاہتے تھے کہ راستہ میں کوئی نہ ملے اور گھر قریب آجائے، مگر اس برسات میں دونوں باتیں مشکل ثابت ہوئیں قدم قدم پر آدمی مل رہے تھے اور گھر تو بالکل اپنی جگہ پر تھا سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ راستہ میں جو شخص بھی ملتا تھا وہ طنزیہ انداز سے ہمیں دیکھ کر مسکراتا یا کچھ گنگنا کر کنکھیوں سے ہماری طرف دیکھتا اور بعض تو ایسے ستم ظریف تھے جو مسکرا کر آداب عرض کرنے سے بھی نہ چوکتے،

آداب عرض ہے۔

تسلیمات،

کہیئے خیریت تو ہے؟

گویا خیریت کی سب سے بڑی علامت چھتری ہے اور جسکے پاس چھتری نہ ہو وہ خیریت سے محروم ہے۔

اِس واقعہ کے بعد بھی چھتری نہ خریدنا غفلت شعاری میں داخل تھا اور غفلت کو نیند اور موت کی بڑی بہن سمجھنا چاہیئے لہٰذا طے کر لیا گیا کہ چھتری خرید کر موسم کے ساتھ اعلانِ جنگ کر دینا چاہیئے خیال یہ تھا کہ بادل چھٹے اور ہم نے چھتری خریدی، ابتدائی بارش قدرت کی تلون مزاجی کا آئینہ ہوتی ہے ذرا سی دیر میں پانی برسنے لگتا ہے ذرا سی دیر میں کھل جاتا ہے چنانچہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد آسمان صاف ہو گیا اور ہم نے اپنے آہنی عزم کو ذرا ڈھیلا کر دیا۔ سچ بات یہ ہے کہ ارادے کی یہ سستی خدانخواستہ کسی کمزوری، بزدلی یا بےحمیتی کی بنا پر نہ تھی، بلکہ اِس تجربہ کی بناء پر تھی کہ چھتریوں کی قیمتیں واقعی غیر معمولی طور پر زیادہ ہو گئی ہیں اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چلتے چلتے سر چھپا کر بھیگنے اور بہادرانہ استقلال کے ساتھ پانی کی ٹھنڈی گولیاں سر پر کھانے کا تجربہ ایک ہفتہ کے اندر چند بار ہو گیا اور ان تلخ تجربات کے بعد بھی چھتری کے حصول میں گرانی کے خوف کو جگہ دینا کھلی ہوئی بزدلی تھی بہرحال چھتری خریدی گئی اور اِس کا استعمال بھی شروع کر دیا گیا حُسنِ اتفاق سے

اُسی دن ایسی موسلا دھار بارش ہوئی کہ ہم نے یقین کر لیا کہ موسم کا سب سے بڑا حملہ یہی ہے اِس خیال کی بڑی وجہ یہ بھی کہ چھتری ہمیں بھیگنے سے نہ بچا سکی البتہ اِس نے ذی شان کے ساتھ بھیگنے کا حوصلہ پیدا کر دیا اور اِس قسم کے بھیگنے میں ذلّت یا کمتری کا احساس نہیں ہوتا نہ یہ شبہ ہوتا ہے کہ قریب سے گذرنے والے ہم پر کوئی طنز کر رہے ہیں اگرچہ برساتی استعمال کرنیوالوں کے تیور ضرور مشتبہ ہوتے ہیں،

جلسوں اور دوسرے ہندوستانی اجتماعات میں خواہ چندے کا کوئی سوال پیدا نہ ہو مگر جوتہ چھتری جیب کے رومال، قلم اور بٹوے کی عافیت بالیقین معرض خطر میں پڑ جاتی ہے اور یہ ہو نہیں سکتا کہ آنے والے خطرات کا خیال کر کے آدمی بٹوے، قلم اور رومال کے ساتھ جوتہ اور چھتری بھی تکیہ کے غلاف میں رکھ جائے عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ مشاعرہ قوالی یا رقص و سرود کے کسی جلسہ میں شرکت سے پہلے اہل خانہ کی دُور اندیشی جو بغیر وارنٹ کے قرقی کرنے کی پوری مجاز ہوتی ہیں، جیبوں کا جائزہ لے کر ہر قسم کے اندیشوں کا سدِّ باب کر دیتی ہے پھر بھی جوتہ اور چھتری کی حفاظت کا بار شوہر ہی کے بلوغ پر آ پڑتا ہے مسجدوں سے جوتوں کی چوری کے واقعات اتنے قدیم ہیں کہ نظیر اکبر آبادی کے دورِ تقدس تک اِس بدعت کا پتہ چلتا ہے چنانچہ نظیر مرحوم نے پورے غصّہ کے ساتھ کہا ہے ؎

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں　　بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآن اور نمازیاں　　اور آدمی ہی اِن کے چُراتے ہیں جوتیاں
جو اُن کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مگر مشاعروں میں چھتریوں کی چوری کا سانحہ زیادہ قدیم نہیں ہے بلکہ زمانہ حال کی پیداوار ہے ورنہ نظیرؔ کے بعد کا کوئی شاعر اس کا تذکرہ ضرور کرتا، بدقسمتی سے مشاعروں میں کہنے، ارشاد کرنے اور فرمانے والے ہوتے ہیں، تاڑنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ مشاعرہ میں چُرائی ہوئی چھتری پھر ہاتھ نہیں آتی اور مصیبت یہ ہے کہ چھتریوں پر گرانی کا پورا اثر ہے، مگر مشاعرے ارزانی سے متاثر ہوتے ہیں نہ گرانی سے، یہ ممکن ہے کہ ارزانی کے زمانہ میں اِن کی تعداد ترقی پذیر نہو مگر گرانی میں کم بھی نہیں ہوتی، چنانچہ موجودہ جنگ عظیم کے اِس نازک دور میں جب گیہوں، شکر، چائے اور چھالیہ کی ہوشربا گرانی کے ساتھ چھتریاں بھی بقول شخصے وادا کے مول بک رہی ہیں مشاعرے بدستور جاری ہیں شعروں کی آمد میں ذرا فرق نہیں، جذبات عشق و محبت کا دھارا ابھی پوری روانی پر ہے اور ہجر و وصال کی داستانیں بھی اتنی ہی طویل ہیں جتنی ہمیشہ سے رہی ہیں، غرض سب کچھ وہی ہے جو ارزانی کے زمانہ میں تھا، لہذا چھتری خریدتے ہی ایک مشاعرہ کا دعوت نامہ ہمیں بھی وصول ہوا۔ خدا خدا کرکے مشاعرے کا دِن آیا اور ہم چھتری اور جوتہ کے اندیشۂ باطل سے فارغ ہو کر غالبؔ و مومنؔ

کے انداز کی ایک لمبی سی غزل کہہ کر صفِ اساتذہ میں جا بیٹھے اتفاق سے اُدھر ایک مبتدی کی غزل سے مشاعرہ کا آغاز ہوا۔ اِدھر استادِ فلک نے بارش کی نظم کہنا شروع کی یہ وقت چھتریوں کے لئے جسقدر خطرناک ہو سکتا تھا ظاہر ہے رفتہ رفتہ تلامذہ کی بھیڑ چھٹی اور اساتذہ کا ہجوم بے پایاں حرکت میں آیا۔ اور مطلع عرض ہے،

شعر قابل ملاحظہ ہے،

جناب فارغ ادھر متوجہ ہو جائیے!

حضرت آبر یہ شعر آپ کے سُننے کا ہے،

مولانا آپ سے گذارش ہے؟

کی لوچدار آوازیں بلند ہوئیں اور یہ سب ہمارے مُنہ سے نکلی تھیں ہم نے ابھی آٹھ دس شعر ہی پڑھے ہوں گے کہ دفعتہً جوتے اور چھتری کیطرف نظر اُٹھی، جوتے تو رکھے تھے مگر چھتری غائب تھی، بس خدا کی قسم ہوش اُڑ گئے مجمع واہ واہ مرحبا پھر عطا ہو" کے نعرے لگا رہا تھا، اور ہم جلدی جلدی متجسسانہ نگاہوں سے چھتری ڈھونڈ رہے تھے، آخر یہاں سے اُٹھا کون؟ اور چھتری کس نے اُٹھائی؟

ہماری طرف سے اعلان ہو چکا تھا کہ شعر عرض کرتا ہوں شاید پسند خاطر ہو اور سامعین، چیخ چیخ کر مطالبہ کر رہے تھے،

ارشاد، فرمائیے، واللہ خوب ہی کہا ہو گا۔

ہم نے گھبرا کر کہا۔ چھتری!

حضرت شاہد صاحب چھتری ہماری!

کسی کو اُمید نہ تھی کہ ہم نے شعر منثور کیا ہوگا طویل قہقہے بلند ہوئے لیکن چھتری کی قیمت اِن قہقہوں سے بہت زیادہ تھی ہم نے بر سبیل احتجاج غزل پھاڑ کر پھینکدی اور میر مشاعرہ سے چھتری کا مطالبہ کیا۔

حضرت نئی تھی یا پُرانی ؟

واللہ حضرت چوری ہو گئی،

بہت کوشش کی گئی کسی طرح سے یہ معلوم ہو جائے اگلی صف سے کون بزرگ اُٹھکر گئے ہیں مگر ایسے ہی حضرت کے نام بتائے گئے خیر چھتری لے جانے کا شبہہ تو کیا جا سکتا تھا مگر مطالبہ نہیں ہو سکتا تھا، ظاہر ہے چھتری کا اس طرح غائب ہو جانا کوئی معمولی بات نہ تھی، اِس کا اثر براہِ راست اِس بٹوے پر پڑتا تھا جو از راہِ عافیت ہینی چلتے وقت شیروانی کی جیب سے نکال لیا گیا تھا تاہم یہ بھی نہ ہو سکتا تھا کہ خود بھی چھتری کے ساتھ گم ہو جائیں، بڑی مشکل سے بھیگتے ہوئے گھر پہونچے تو سب سے پہلا سوال جو انھیں ملتے ہوئے کیا گیا تھا یہ تھا ،، وہ چھتری کیا ہوئی،،

ہم نے کہا۔ کیا بتاؤں ؟

کیا پھینک آئے تھیں ؟

چرالی کسی نے ؟

نہیں استاد محشر لے گئے ہیں صبح آجائے گی،

اجی وہ محشر ہوں یا قیامت آپ نے دی کیوں انہیں چھتری؟
دی کہاں یوں ہی اٹھا لے گئے!
پھر کیونکر آ جائے گی صبح کو؟
شاید آ جائے!
جی ہاں آ چکی!

برسات کا طویل زمانہ بغیر مشاعرے کے گذر جائے تو گذر جائے مگر چھتری کے بغیر نہیں گذر سکتا مجبوراً جس طرح لڑنے والے ملک ڈوبے ہوئے جہاز کی کمی کو پورا کرنے کی غرض سے دوسرا جہاز سمندر میں ڈالنے پر مجبور ہو جاتے ہیں ہمنے بھی اسی طرح اور انہیں حالات میں دوسری خریدی یہ ایثار ویسا ہی تھا جیسا پریذیڈنٹ روزولٹ بڑے بڑے جنگی بجٹ کانگریس کے سامنے پیش کر کے کیا کرتے ہیں۔ اب چھتری کی حفاظت میں ہم کافی مستعد ہو گئے تھے۔

بڑے آدمیوں کے نوکر بڑی بیدردی سے ان لوگوں کی چھتریاں اُٹھا لیتے ہیں جو کسی "صاحب" سے ملنے آتے ہیں، جہاں کوئی چھتری والا آیا اور اردلی نے ڈانٹ کر کہا، چھتری نہیں رکھدو فرش بھیگ جائے گا"

آنے والے کو بھی بھیگی ہوئی چھتری جس سے مسلسل پانی ٹپکتا رہا ہے۔ اندر لے جاتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا ہے اور احتیاط سے کسی کونہ میں ٹکا کر وہ اندر چلا جاتا ہے واپسی کے وقت

اردلی معہ چھتری کے غائب ہوتا ہے۔ صاحب کے یہاں ایسے استغاثوں کی سماعت کا کوئی انتظام نہیں ہوتا، لہٰذا امیدوار چھتری اور درخواست دیکر چلا جاتا ہے۔ نتیجہ میں نہ چھتری ملتی ہے نہ ملازمت،

پھر دیدہ دلیری دیکھئے اُسی برسات میں "اردلی" وہی چھتری لگائے ٹماٹر خریدتا ہوا کہیں بازار میں مل جاتا ہے تو آپ کو دیکھکر معنی خیز انداز سے مسکرانے لگتا ہے، گویا زبانِ حال سے کہہ رہا ہے، کیسا احمق بنایا ہے،

لیکن جب آپ ہمت کر کے اِس سے کہیں گے چھتری میری ہے تو وہ تیوری چڑھا کر کہے گا، واہ میری ہے "

کیا ثبوت ہے تمہاری ہے؟

اوّل تو یہ میرے پاس ہے، پھر میرا نام بھی لکھا ہوا ہے۔

کیا نام ہے تمہارا؟

وہی جو چھتری پر لکھا ہے۔

اِس پر تو میری بیوی نے جاپانی سوئی سے لکھا ہے" ایم۔ ایم حسن!

یہی میرا نام ہے۔

بھائی میں تو اِس نام سے درخواست دے چکا ہوں صاحب کے یہاں! اور میں اِس نام سے انھیں کے یہاں دس سال سے نوکر ہوں۔

بہرحال جنگ کے پرآشوب زمانہ میں ہر چیز خطرے میں ہے

مگر ہماری رائے میں سب سے بڑا خطرہ کم سے کم برسات، برسات صرف چھتری کو ہے! خدا کرے کسی ہندوستانی کو دوسری مرتبہ چھتری نہ خریدنی پڑے!

بجلی!

دُنیا کی اِن چیزوں میں جس کے بغیر انسانی زندگی "بیہودہ" کہی جا سکتی ہے بجلی سب سے پہلے نمبر پر ہے۔ جب تک یہ آسمان کے لئے مخصوص تھی اِس کی چمک، سُرعت رفتار وغیرہ سے استعارات وتشبیہات پیدا کی جاتی تھیں محبوب کے تبسم کو بجلی کی چمک سے تشبیہہ دے کر برقِ تبسم اور خندۂ برق اور اسی قسم کے استعارے وضع کئے جاتے تھے اِس وقت تک کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ ایک دن ایسا آئے گا جب بجلی آدمی کی صحت وتندرستی بیماری اور اُس کے علاج، روشنی غرض انسانی ضروریات کے ہر شعبہ پر قابض ہو جائے گی، گھر کی رونق بھی بجلی کی شرمندۂ احسان ہوگی۔ گھر کے دردہیں بھی بجلی کام آئیگی۔ پیام رسانی میں اس کا درجہ نامہ برکبوتر اور صبا رفتار قاصد سے بلند ہو جائے گا پنکھے بھی بجلی سے چلیں گے۔ ٹرام کی تیز رفتاری میں بھی یہی کارفرما ہوگی حتیٰ کہ ریڈیو کے نغمات شیریں میں بھی اسی کی جلوہ طرازیاں ہونگی۔ آج صرف بجلی ہی وہ چیز ہے جو بغیر محبوب کے بھی گھر کی رونق کا باعث بن سکتی ہے حالانکہ محبوب بغیر بجلی کے اب بے پتنے

کا خطرہ گیا ہے۔ بجلی نے جہاں چراغ، شمع، قندیل، لیمپ اور لالٹین اور اسی قسم کے دوسرے قاتلانِ پروانہ کو شکست فاش دی ہے وہاں اپنی فتحمندی کے پرچم بھی اس شان سے اڑائے ہیں کہ بڑے سے بڑا دشمن انھیں سرنگوں نہیں کر سکا۔ اب سے پہلے جو حیثیت قلوپطرہ اور اس کے قصرِ حسن و عشق کی تھی اس سے بہت بلند آج الکٹرک انجنیر اور پاور ہاوس کی ہے جہاں سے بجلی کی شعاعیں پیدا ہو کر بہت سے گھروں میں اجالا کرتی اور دلوں میں زندگی کی روح دوڑاتی ہیں۔

جس گھر میں بجلی نہیں اسے ہندوستان کا "افریقہ" کہا جا سکتا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ ان گھروں میں کیا جا سکتا ہے جہاں روشنی اور پنکھے سے لے کر غسل خانہ اور حمام تک کی ساری ضروریات میں "برق خاطف" کی تڑپ کارفرما ہے اور انھیں میں خدائے برق یعنی الکٹرک انجنیر کے رتبہ کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ایک مرتبہ رات کو دس بجے ہم ایک معزز میزبان کے یہاں کھانا کھا رہے تھے، کمرے میں بجلی کے قمقمے جابجا آویزاں تھے اور کثرت تنویر سے کمرہ شاعر کا دل بنا ہوا تھا۔ دفعتہً بغیر کسی اعلان یا آواز کے ایسا معلوم ہوا کہ آنکھوں سے بصارت معدوم ہو گئی اور ایسا اندھیرا چھایا کہ ہاتھ سجھائی نہ دینے کی ضرب المثل میں اچھی خاصی واقعاتی صداقت نظر آنے لگی۔ ہم تو یہ سمجھے کہ جاپان نے شہر کے کسی حصہ پر شیطانی حملہ کر دیا اور اربابِ دعوت کو بچانے کی غرض سے کسی عقلمند نے کمرے

میں بلیک آؤٹ کر دیا۔ میزبان جلدی سے کھڑے ہو گئے اور کئی طرف سے کھٹ کھٹ بٹن دبانے کی آوازیں بھی آئیں مگر بجلی کے رُخ زیبا سے نقاب نہ اُٹھ سکی اتنے میں اندر سے آواز آئی ریڈیو بند ہو گیا بجلی کھو لیئے۔ غسل خانہ سے ملازم چیخا ارے پانی تو گرم ہو جانے دو! اور ذرا دیر بعد جو اِس بلیک ہول کے باشندوں نے اپنے کپڑوں پر غور کیا تو پسینہ میں تر تھے۔ خیال آیا کمرے میں جو فردوسی ہوائیں مسلسل اور متواتر آ رہی تھیں یہ ہمارے نیک اعمالی کا نتیجہ نہ تھیں بلکہ بجلی کے اِن پنکھوں کے اثر سے تھیں جو بڑی تیزی سے بالکل قلب مضطرب کے انداز پر حرکت کر رہے تھے حاضرین میں سے کسی نے چلا کر کہا لالٹین منگائیے!

لیمپ ہی لائیے!

ارے چراغ جلا لو نا!

لیکن یہ مطالبہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے روس کے محاذِ جنگ پر جنرل سوشنگر سے توپ، رائفل اور مشین گن کی جگہ کوئی بھرت کی بندوق مانگ بیٹھے، ذرا خیال تو کیجیے جس گھر میں بجلی کے سوا کبھی لیمپ یا لالٹین جلی ہی نہ ہو وہاں اُنکی موجودگی کے معنی ہی کیا ہو سکتے ہیں شرفا کا گھر کوئی عجائب خانہ تو ہوتا نہیں کہ گذشتہ صدیوں کی قدیم اشیاء ہر وقت وہاں موجود رہا کریں وہ تو صحیح معنی میں گھر ہوتا ہے جسمیں خدا سے زیادہ بجلی کی حکومت ہوتی ہے، پھر وہاں لیمپ اور لالٹین

رکھ کر شرک کی ذمہ داری کون لے سکتا ہے۔

دیر تک بٹن دبائے جاتے رہے، قمقموں کی دیکھ بھال ہوتی رہی مگر روشنی نہ ہونا تھی نہ ہوئی، بالآخر اندر سے کسی بوڑھی عورت نے ڈانٹ کر کہا "ہم نے تو پہلے ہی کہا تھا اس موت بڑے انجینئر کو ضرور بلوالیا ہوتا۔ دعوت میں ایک دفعہ نہیں دس دفعہ تجربہ ہو چکا ہے جب گھر میں کوئی کاج ہوگا جب ہی بجلی پر آفت آئیگی، دیکھو سامنے کے سب گھروں میں بجلی جل رہی ہے اور ہمارے یہاں اندھیرا پڑا ہے۔"

"لو واہ دوسری لائن ہے!" کسی نے اندھیرے میں جواباً عرض کیا۔ لائن دوسری ہوا کرے۔ انجینئر تو ایک ہے۔ میں جانتی ہوں یہ اس سے جلا ہوا ہے جب سے منی کے عقیقہ میں اس کو نہیں بلایا گیا تھا۔ اُس دن بھی اس نے ہمارے ہی گھر کی بجلی بجھائی تھی۔

دیر تک سب بیٹھے ہنستے رہے آخر ایک دوست نے فون سے انگریزی میں انجینئر صاحب سے کہا جناب کھانا سامنے رکھا ہے اور بجلی گل ہو چکی ہے آپ پر یہ الزام ہے کہ آپکی دعوت نہیں کی گئی اسلئے آپ نے بجلی بجھا دی گیا آپ کے پاس اس الزام کا کوئی معقول جواب ہے بہر حال کھانا شروع نہیں کیا گیا وجہ ناراضی ختم کی جا سکتی ہے بشرطیکہ بجلی جل اُٹھے۔

آہستہ سے ایک قہقہہ کی آواز آئی اور تھوڑی دیر بعد ہی بجلی نے قمقموں میں جھلملانا شروع کر دیا۔ بجلی کے ایکدم گل ہو جانے سے

بعض اوقات بڑے بڑے لطیفے تصنیف ہو جاتے ہیں۔ اِس زمانہ میں بھی اکثر بزرگوں کا خیال ہے کہ بجلی تیل سے چلتی ہے۔ ایک دیہاتی بزرگ اپنے وکیل کے پاس بیٹھے ہوئے مقدمہ کے کاغذ انھیں دکھا رہے تھے میز پر بجلی کا لیمپ رکھا ہوا تھا اور کمرے میں دھوپ سی نکلی ہوئی تھی۔ دفعتہً کسی وجہ سے بجلی بجھ گئی، دیہاتی اندھیرے میں منشی جی کی طرف مخاطب ہو کر بولے منشی جی تیل ختم ہو گیا تیل ڈالئے جلدی سے اِس میں!

زمانہ موجودہ میں بہت شیطان دریافت ہو چکے ہیں چنانچہ کتابت کی غلطیاں شیطان کتابت سے منسوب کی جاتی ہیں ہماری رائے میں شہروں میں ایک عجیب وغریب قسم کا شیطان جسے شیطان برق کہنا چاہیئے پیدا ہو چکا ہے اور اچانک بجلی کا بجھ جانا، یا اُس کا تاروں سے نکل کر انسانی زندگی پر حملہ کر دینا یا گھروں میں آگ لگا دینا سب اِسی شیطان برق،، کی شرارتوں کے نتائج ہیں، ورنہ حقیقت میں بجلی ''نور،، ہے اور نور کو اِن ہلاکتوں سے کیا واسطہ؟

بجلی اور انجنیر کے درمیان ایک اور طاقت بھی ہے جو بعض اوقات گھر میں بجلی سے ہونیوالے تمام کاموں میں اختلال پیدا کر دیتی ہے اور یہ ہے صاحب خانہ کا بوڑھا افیون کھانے والا ملازم جو اپنے آقا کی ہدایت سے رات کو گیارہ بجے سے پہلے ہی صبح کے پانچ بجا کر بجلی کا بٹن دبا دیتا ہے اور سارے گھر میں بجلی کے بند ہو جانے

سے قیامت سی برپا ہو جاتی ہے۔ ریڈیو، پنکھے، لیمپ، غرض ہر چیز اپنی اپنی جگہ خاموش اور بے کار ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ افیون کھانے والا ملازم جو خیر سے عمر رسیدہ بھی ہوتا ہے وفاداری کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ ہوتا ہے اور جب تک وہ خود یقین نہیں کر لیتا کہ واقعی رات کے دس ہی بجے ہیں کسی طرح بجلی نہیں جلاتا وہ جانتا ہے اس میں اس کے آقا کا نقصان ہے اور صبح کے اجالے میں بجلی جلانا ایک اندھیر ہی ہو سکتا ہے اسے روشنی سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔

ایک مرتبہ ہمارے دوست کے یہاں نہایت شاندار مشاعرہ تھا روشنی خاص طور پر دلچسپ تھی، بڑے بڑے نامور شعرا موجود تھے ایک صاحب بڑی خوش الحانی سے غزل سنا رہے تھے کہ ایک دم اندھیرا گھپ ہو گیا میر مشاعرہ جو اپنے وفادار ملازم کی خصوصیات حماقت سے واقف تھے چلائے۔ شبراتی کیا سو گئے؟

ارے بجلی کیوں بجھا دی؟

سو نہ جانے جاگتے جاگتے ناک میں دم آ گیا۔ برابر کے کمرے سے بڑی بھدی آواز میں میاں شبراتی نے فرمایا:۔ پانچ بج چکے اب بجلی بجھانے کا وقت ہے یا جلانے کا؟

ارے ابھی تو بارہ بجے ہیں بجلی کھولو،

دن میں بجلی کھولنے کی کیا ضرورت ہے؟

معلوم ہوتا ہے تم اونگھ رہے ہو۔ ابھی دن نہیں نکلا تحقیق کرنے پر ظاہر ہوا کہ میاں شبراتی کا کام صرف یہ ہے کہ وہ صبح سویرے ہی بجلی گل کر دیا کریں چونکہ وہ افیون بھی کھاتے ہیں اس لئے پینک میں اکثر وہ "شیطانِ برق" کے روپ میں آجاتے ہیں اور سوتے سوتے ایک دم بیدار ہو کر سمجھ لیتے ہیں کہ صبح ہو گئی، پھر فوراً بٹن دبا دیتے ہیں۔

اس مشاعرہ کے ایک ہفتہ بعد ہی یہ افسوس ناک اطلاع ملی کہ جناب شبراتی سے بجلی نے بار بار گلا گھونٹنے کا انتقام لے لیا اور ایک دن جو وہ اونگھتے اونگھتے اٹھے اور بجلی کے بٹن پر ہاتھ رکھا تو ایک دھماکے کے ساتھ دُور جا پڑے جب دوسرے لوگ پہنچے تو بجلی جل رہی تھی مگر شبراتی کا چراغ حیات گل ہو گیا تھا۔ بس بجلی میں یہی ایک عیب ہے کہ جب وہ برہم ہو جاتی ہے تو پھر یہ نہیں دیکھتی کہ اس کی برہمی سے دوسروں کی جان پر کیا بن جائے گی۔ اور وہ کر ڈالتی ہے جو بجلی ایسی زینت خانہ کو نہ کرنا چاہیئے ایک دولتمند بزاز رات کو دوکان میں اچھے خاصے سوئے صبح کو معہ تمام ساز و سامان کے "دستی" ہو کر رہ گئے۔ ماہران برق نے دیکھ کر کہا کہ یہ سب بجلی کے کرشمے ہیں کہ اُس نے اپنی ایک نگاہ کرم سے اُنھیں خاکستر کر دیا۔

اس قسم کے انسان سوز حوادث سے قطع نظر کر کے بجلی کی

ہر ادا دلفریب ہے۔ لیکن مہینے کے شروع میں بل کی ادائیگی کے وقت بھی "بجلی" ذرا بدنما ہو جاتی ہے خصوصاً جب دس روپیے کی جگہ پندرہ روپیے کا بل آجاتا ہے تو اُس سے زیادہ نفرت کی چیز وہ گھر بھی نہیں ہوتا جس کا کرایہ ہمیشہ تیس روپیے ماہانہ دیا جاتا ہے۔ بل لانے والے چپراسی سے جس کو اکثر ارباب ذوق "شیطان برق" ہی سے موسوم کرتے ہیں۔ کتنا ہی کہا جائے، بھائی بجلی ہمارے یہاں اتنی نہیں جلی ہم تو روزانہ گیارہ بجے گُل کر دیتے ہیں مگر وہ بل کا روپیہ لیئے بغیر ٹلتا ہی نہیں اِس کا جواب ہمیشہ یہی ہوتا ہے، جو آپ کا میٹر بتاتا ہے وہی لیا جاتا ہے۔ اگر دوسرا مقیاس البرق (میٹر) بھی بدل لیا جائے تو بھی یہ حادثہ کبھی نہ کبھی ہو کر ہی رہے گا۔ ہمارے یہاں بیت الخلا کی بجلی کبھی نہیں جلتی۔ مگر جب گھر کے کسی ہمعصر کو قبض یا اور کوئی بے اختیاری بیماری لاحق ہو جاتی ہے تو مجبوراً بجلی کے صرف میں اضافہ کرنا ہی پڑتا ہے یہ موقعہ بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ ایک طرف بجلی کا بل، دوسری طرف ڈاکٹر اور دوافروش کا بل اور اِن بلوں کے لانے والے سب فرشتہ موت کے شاگرد رشید ہوتے ہیں جن کو استادان ازل نے مہلت کی درخواست پر صرف "نامنظور" لکھنے ہی کا سبق دے رکھا ہے۔